غبارِ خاکی

سبط اختر

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی

غبارِ خاکی

زبیر رضوی کے لیے بہت خلوص کے ساتھ

سبط اختر

2 / اپریل 2003

غبارِ خاکی

سبط اختر

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مصنف کے کوائف

نام : سبط اختر

والد کا نام : سبط صفدر

پیدائش : ۵ر مئی ۱۹۳۵ء، امروہہ

تعلیم : درجہ ہشتم : گورنمنٹ ہائی اسکول، امروہہ

انٹرمیڈیٹ : اسلامیہ کالج لکھنؤ

بی کام : لکھنؤ یونیورسٹی

ایل ایل بی : کراچی یونیورسٹی

مستقل پتہ : Unit No. 203, 792 E 3rd Avanu,

Roselle NJ 07203

فون نمبر : 908-245-3243

تصنیفات : • جھوٹ بولے کوا کاٹے (طنز و مزاح)

• بیچ کی کھڑکی (طنز و مزاح)

فہرست

صفحات

کہنے کو بہت کچھ ہے (دیباچہ)	سبط اختر	۹
بڑی مشکل سے ہوتا ہے...		۱۲
کہانی گھنٹہ گھر کی		۴۲
میرے محبوب		۶۴
مست قلندر		۷۶
لے سانس بھی آہستہ		۸۵
بسوں سے کود کے مرنے کے ہم نہیں قائل		۸۹
اوڑھنی اور چہار دیواری		۹۷
اس حادثہ پہ کون نہ مر جائے اے خدا		۱۰۰
عشق اول در دلِ معشوق...		۱۰۸
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے		۱۱۰
رتن سنگھ		۱۱۴
اقبال مجید		۱۲۷

کہنے کو بہت کچھ ہے

اگر کہنے پہ آئیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہم کہنے پہ آئیں کیوں۔ ہم تو کسی کے کہنے میں نہیں آئے پھر اپنے کہنے پہ کیسے آجائیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے پاس بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے بھی نہیں۔ وقت کے لحاظ سے بھی اور صفحات کے لحاظ سے بھی۔ وقت میں اس لیے کہ ہمارا ویزا ختم ہونے والا ہے اور ہمیں ابھی کئی جگہوں کے لمبے لمبے سفر کرنے ہیں۔ صفحات میں اس لیے کہ ہماری کتاب کے کمپوزر محمد اسلام خان نے بالکل شروع کے دو تین صفحات خالی چھوڑ دیے ہیں اور ہم سے کہہ دیا ہے کہ یہ دیباچے کے لیے ہیں آپ جلدی سے دیباچہ لکھ دیجیے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ساری کتاب ہم نے ہی لکھی ہے تو پھر دیباچہ ہم کیوں لکھیں؟ کوئی اور لکھے۔ یا خود کمپوزر صاحب لکھیں۔ مگر یہاں تو عجب نفسانفسی کا عالم ہے۔ کوئی شخص بھی دیباچہ کیا کچھ بھی لکھنے کو تیار نہیں ہے۔ جس سے بات کرو صاف جواب دیتا ہے کہ ہم خود دوسروں سے لکھوا رہے ہیں۔ تمھیں کیسے لکھ دیں۔ ہمیں لکھنا ہوتا تو خود اپنی کتاب دوسروں سے کیوں لکھواتے؟ یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ ابھی حال ہی میں ہم نے اپنے دوست کی ڈاکٹر قمر رئیس کی ایک کتاب دیکھی ہے جس کے سرِورق پر ان کی تصویر بھی چھپی ہے اور لکھا ہے ''قمر رئیس: ایک زندگی'' یہ تقریباً 500 صفحات کی کتاب ہے۔ مگر ہم نے ساری کتاب چھان ماری اس میں کہیں ایک سطر بھی قمر رئیس صاحب کی لکھی ہوئی نہیں ملی۔ بلکہ بیسیوں دوسرے لوگوں کی تحریریں ہیں۔ جبکہ ہماری تو ساری کی ساری کتاب خود ہماری اپنی ہی لکھی ہوئی ہے۔ ایک دیباچہ کسی اور کا لکھا ہوا ہو جائے گا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ بہر حال اب خالی صفحات کو تو بھرنا ہی ہے۔

ملاقات کے لیے بے چین تھے ہم نے ایک دوست کے ذریعہ ان پر یہ راز منکشف کرایا کہ دراصل سلمٰی اختر نام کی کوئی خاتون موجود نہیں ہیں۔ اور یہ خاکسار یعنی سبط اختر اس ''پردۂ نگاری'' میں روپوش ہیں۔ اس انکشاف سے ''سلمٰی اختر'' کے اس دل جلے عاشق پر بجلی، بلکہ بجلی کا کھمبا گر پڑا اور اس نے گالیوں اور مغلظات سے بھرا ہوا ایک پوسٹ کارڈ سبط اختر کے نام لکھا جو ڈاکیے نے انعام لینے کی خاطر ایک دن روک کر بطور خاص عید کے ''مبارک'' دن ہمیں پہنچایا۔ ہم دروازے پر ہی ایک پڑوسی سے عید مل رہے تھے۔ ڈاکیے سے پوسٹ کارڈ لے کر پڑھنے سے پہلے اسے دو روپے عیدی دیے۔ کاش کہ ہم نے ڈاکیے کو عیدی دینے سے پہلے ہی وہ پوسٹ پڑھ لیا ہوتا۔ کم از کم دو روپے تو بچ ہی جاتے۔ اگر وہ عاشق ناکام بذریعہ ڈاک گالیاں دینے کے بجائے منہ زبانی اس سے زیادہ گالیاں دے دیتا تو طبیعت اس قدر منغّض نہ ہوتی۔ کیونکہ مروّجہ اصول کے مطابق گالیاں پڑھنے سے زیادہ ''کھانے'' میں مزہ آتا ہے۔

سنا ہے گالیاں کھا کے تو رقیب تک بے مزہ نہیں ہوتا۔

سبط اختر

نوٹ : کتاب کے آخر میں میرے دو عزیز دوستوں اقبال مجید اور رتن سنگھ کے خاکے بھی شامل ہیں۔ ایک تو یہ دونوں کتاب کے مزاج کے مطابق مزاحیہ انداز لیے ہوئے ہیں جو قارئین کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ مزید کوئی خاکے لکھنے کا فی الحال کوئی امکان نہیں ہے کہ خاکوں کا کوئی علاحدہ مجموعہ شائع کرا سکوں۔

آجکل تو سائنسی ترقی اور بڑھتے ہوئے پولیوشن (Pollution) کی وجہ سے سیکڑوں سال بھی کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ خود ہم صدیوں کے بعد اپنے خاندان کے واحد خوش نصیب ہیں جو دوسری صدی دیکھ رہے ہیں بلکہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کیونکہ:

جو کچھ خدا دکھائے وہ ناچار دیکھنا

ورنہ ہمارے خاندان کی یہ روایت چلی آرہی تھی کہ جو شخص جس صدی میں پیدا ہوتا اسے اسی صدی میں انتقال کرنا لازمی تھا۔ دعا کیجیے کہ ہم دو چار صدیاں اور دیکھ لیں تاکہ نرگس غریب کے رونے کی مدت ''ہزاروں'' سال سے کم ہوکر ''سیکڑوں'' سال تک رہ جائے۔ ہمارے محلّہ میں تو سو سال والے بھی شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ اور اس بات پر ناشاد رہتے ہیں کہ وہ خود کو نظر بھی نہیں آتے۔ بلکہ جن کو نظر آتے ہیں وہ خود بھی غریب پچاس سال مشکل ہی سے دیکھ پاتے ہیں۔ کیونکہ بقول شاعر:

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

حالانکہ اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو چند روزہ زندگانی نہیں بلکہ چند روزہ نوجوانی میں ہی تیری میری اور اس کی ملاکر دسیوں بیسیوں زلفیں سر کر لیتے ہیں۔ ہم اپنی بات کیا کریں۔ ہم تو آدھی سے زیادہ جوانی ایک ہی زلف کے سر کرنے میں گنوا چکے تھے۔ دوسری سر کرنے چلے تھے۔ اور ابھی آدھی بھی بڑی مشکل سے سر کر پائے تھے کہ بڑھاپے نے آلیا۔ (اتنی مشکل سے کم از کم ایک دیدہ ور تو پیدا ہو ہی جاتا ہے)۔ چنانچہ یہ سوچ کر باقی آدھی زلف اور حوصلہ چھوڑ دیا کہ کہیں آدھے بڑھاپے سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔

ہمارے یہاں شاعروں کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہر چیز میں بحر کی پابندی ضروری سمجھتے ہیں۔ جبکہ شرع کی پابندی شادی کے علاوہ کسی معاملہ میں ضروری نہیں سمجھتے۔ تھوڑی دیر کے لیے بیوی بھی بحر سے خارج ہو جائے تو اس کو برادری سے خارج کر دیتے ہیں اور شرعی حق استعمال کرنے کی دھمکی دے دیتے ہیں جس سے وہ غریب محروم ہے۔ حالانکہ ایک دھمکی، مطلب ایک بیوی تک اکیلے سنبھالی نہیں جاتی اور اسے بھی محلے والوں کی

بالکل شروع ہی میں یہ غلطی ہوگئی تھی کہ جسے ہم نفس بنانا تھا اسے بوریانشیں بنانے کے بجائے تخت نشیں بنادیا اور اس نے الٹا ہمارے ہی خلاف جہاد شروع کر دیا۔ وہ تو خیریت ہوگئی کہ محلے والوں نے بیچ بچاؤ کرادیا اور ہم دونوں برابر سے چھوٹ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اس کے بعد سے اب صرف اپنے ہی نفس کے خلاف جہاد کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ہم نفس پر غالب آجاتے ہیں اور کبھی نفس ہم پر۔ بس اسی نفسا نفسی اور ہماہمی کے عالم میں نماز روزہ ہی کیا حج بھی چھوٹ جاتے ہیں۔ ویسے بھی جب تک اس بات کا تعیّن نہ ہو جائے کہ اصل میں ہمارا تعلق کس فرقے سے ہے، ہم ان چیزوں سے ''حتی الایمان'' پرہیز کرتے ہیں۔ خصوصاً اس خوف سے کہ اگر خدانخواستہ بدپرہیزی کرنے میں ذرا بھی غفلت اور بے احتیاطی کر بیٹھے اور قتل ہو ہوا گئے تو مستقل یہ بے چینی لگی رہے گی کہ کہیں ہمارا قاتل بے قصور ہی جہنم میں نہ چلا جائے۔ اس غریب کو تو وہاں سے نکلنے کا راستہ بھی نہیں معلوم ہوگا۔ ویسے اپنی طرف سے ہم اتنی احتیاط ضرور کر لیتے ہیں کہ اگر کبھی نماز پڑھنی ہو تو ہاتھ باندھ کر یا کھول کر پڑھنے کے بجائے، اوپر کو اٹھا کر پڑھتے ہیں یعنی بالکل Hands-up یا دست برداری والی پوزیشن میں۔ تاکہ قاتل کو بالکل ہی Free Hand مل جائے۔ مزید احتیاط یہ کر لیتے ہیں کہ کسی مسجد یا امام بارگاہ کے بجائے کھلے میدان میں پڑھتے ہیں۔ کھلے بندوں اور کھلے دل کے ساتھ۔ اس سے اکثر فرقوں کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کوئی نیا فرقہ بنا رہے ہیں جس کا نہ تو پرانے فرقوں سے کوئی تعلق ہے اور نہ فرقہ پرستی سے۔ لوگوں کا یہ خیال غلط ہے۔ دوسرے تمام فرقوں کی طرح ہمارا نیا فرقہ بھی فرقہ پرستی کو جمہوری اقدار کی مضبوطی کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ ہم تمام فرقے اس ایک نکتے پر متفق ہیں کہ فرقہ پرستی کے علاوہ اقربا پروری، ذخیرہ اندوزی، رشوت، چور بازاری اسمگلنگ، چوری اور ڈکیتی ملک کی بقا اور جمہوریت کے استحکام کے لیے ضروری ہیں۔ ان کے فروغ کے لیے ملک بھر میں تربیت گاہیں قائم کی جانی چاہئیں۔ اس سے نہ صرف ملک اور جمہوریت مضبوط ہوگی بلکہ ہر فرقہ کے غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر میں بھی اضافہ ہوگا اور افراط وتفریط زر میں بھی۔ ہم سب

کمر لچکے موری بھاری گگریا کیسے لے جاؤں

حالانکہ گگریا تو گگریا ''تمہارے'' سر پر اس کا چپّن بھی رکھ دیا جاتا تو وہ بھی سالا پچک کے ٹوٹ جاتا۔ پتہ نہیں میر انیس نے تمھیں نہاتے ہوئے کیسے دیکھ لیا تھا۔ ''تم'' تو ہماری طرح نہ صرف کھانے پینے میں پرہیز کرتے تھے، بلکہ نہانے دھونے میں تو خاص طور پر بڑی احتیاط کرتے تھے۔ نہانا تو نہانا کبھی پنڈا بھی دھوتے تھے تو چاروں طرف ایک نہیں چار چار پائیاں کھڑی کر لیتے تھے۔ گویا تم سے زیادہ تو تمہاری چارپائیاں نہاتی تھیں۔ جس کو دیکھنا ہوتا تھا وہ تمہاری چارپائیاں ہی دیکھ کے غصہ اور پیاس بجھالیتا تھا۔ میر انیس والے دن شاید غلطی سے یا غلط فہمی سے ایک طرف کی رہ گئی ہو، اور تین ہی ''پائیاں'' کھڑی کی ہوں۔ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ چلو اس بہانے میر انیسؔ کا یہ خوب صورت شعر یاد آ گیا:

مثالِ ماہیِٔ بے آب موج تڑپا کی
حباب پھوٹ کے روئے جو تم نہا کے چلے

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر اس روز خدانخواستہ ''تم'' بغیر نہائے ہی چلے گئے ہوتے، یا اتفاق سے چوتھی چارپائی بھی مل گئی ہوتی اور اس روز بھی تمہارے ساتھ تین کے بجائے چاروں چارپائیاں نہائی ہوتیں تو حباب غریب تو اپنی قسمت ہی کو روتے اور نہ جانے کب تک روتے۔ کیونکہ ''تمہارے'' نہانے کے تو وقفے بھی غیر معینہ مدت کے ہوتے تھے۔ کبھی جمعے کے جمعے نہاتے تھے کبھی مہینے کا بھی طے نہیں ہوتا تھا۔ حساب کتاب میں تم ہمیشہ ہی سے کمزور تھے۔ نہ تو نیک و بد لوگوں کی شناخت تھی اور نہ اچھی بری تاریخیں یاد رہی تھیں جس کی وجہ سے اکثر جنتری ساتھ لے کر نہاتے تھے۔ یہ جنتری کے ساتھ نہاتے ہم نے تمھیں کو دیکھا۔ دیکھا نہیں بلکہ سنا، وہ بھی حباب سے ہی سنا۔ ورنہ ہماری ایسی قسمت کہاں۔ جنتری تو جنتری، تمہارے ساتھ نہانے والی ایک چارپائی کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ڈکشنری پر بیٹھ کر تو کبھی کبھار ہم بھی نہائے ہیں۔ جب بیٹھنے کے لیے کوئی پٹرا یا پیڑھی نہیں ملی

چھوڑ دے۔ کیا پتہ کس کے نہانے یا چلنے سے وہ پھر سے پھوٹ پڑیں۔ ہم نے تو ''تمھیں'' بغیر نہائے چلتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور نہا کے چلتے ہوئے بھی، بلکہ کئی بار تو نہاتے ہوئے بھی دیکھا۔ بس یہ ہے کہ کبھی نہاتے میں چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یعنی اس طرح جس طرح سوتے میں چلتے ہوئے اکثر دیکھا ہے مگر سوتے میں نہاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ خیر سوتے میں تو کوئی نہاتا بھی نہیں ہے اور نہ نہاتے میں کوئی چلتا پھرتا ہے۔ ہاں نہاتے میں اچھلتے کودتے اور Enjoy سبھی کرتے ہیں۔ وہ تو ہم بھی کرتے ہیں۔ اور آس پاس کے لوگوں کو بھی ایسا کرتے دیکھا ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے سبھی ایک ہی طرح نہاتے ہیں اور چلتے ہیں۔ خواہ پہلے چلیں یا بعد میں۔ چھٹی چھلّے کی بات دوسری ہے۔ اس میں تو سبھی کا چلنا پھرنا اور نہانا تک مختلف، بلکہ دوبھر ہو جاتا ہے۔ اس لیے عام طور پر لوگ Avoid کرتے ہیں۔ چلنا پھرنا نہانا دھونا حتیٰ کہ رونا دھونا بھی۔ بس بیٹھے بیٹھے پھوٹتے رہتے ہیں۔ کڑھتے رہتے ہیں۔

جہاں تک احتیاط کا تعلق ہے، میر انیس ہی کیا، اس زمانے میں سارے ہی میر صاحبان بہت احتیاط اور آپس میں ایک دوسرے کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ کسی کے گھر جاتے تھے تو پہلے احتیاطاً گھر میں جھانک کر دیکھ لیا کرتے تھے کہ کہیں کوئی چارپائی اِدھر اُدھر کھڑی ہوئی تو نہیں ہے۔ اگر ایک بھی چارپائی کھڑی ہوئی ہوتی تھی تو اس گھر میں کبھی جھانکتے تک نہیں تھے۔ کوئی شخص اگر کسی میر صاحب کو دور سے بھی آتا ہوا دیکھ لیتا تھا تو آنکھیں بچھانے سے پہلے گھر میں جتنی بھی چارپائیاں کھڑی ہوتی تھیں، انھیں بچھاتا تھا۔ چاہے کوئی نہ بھی نہا رہا ہو تب بھی۔ اس کے بعد میر صاحب کو گھسیٹ کر زبردستی گھر میں جھنکواتے تھے۔ اتنا احترام تھا میر صاحبان کا اس زمانے میں۔ اور اتنی ہی برکت تھی میر صاحب کے جھانکنے کی۔ اگر کوئی میر صاحب کسی کے گھر میں ایک بار بھی جھانک لیتا تھا تو سارے گھر والوں کو مہینوں تک نہانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اور اس زمانے میں کوئی شخص بغیر ضرورت کوئی بھی کام نہیں کرتا تھا۔ اور نہانے کا کام تو عام طور پر ضرورت پڑنے پر

دیدہ ور کی ضرورت پیش آنی شروع ہی ہوئی ہے۔ وہ زمانہ ختم ہو گیا جب ہزاروں سال میں جا کر کہیں ایک دیدہ ور پیدا ہوتا تھا وہ بھی بڑی مشکل سے۔ دراصل اس زمانے میں دیدہ ور کی پیدائش Discourage کی جاتی تھی۔ طرح طرح کی شرطیں اور پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ اگر یہ پابندیاں نہ لگائی جاتیں تو آجکل کے گریجویٹوں یا ایم اے، پی ایچ ڈیوں کی طرح دیدہ ور بھی مارے مارے پھرتے۔ بالکل ''میر خوار'' کی طرح۔ کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہوتا۔ حالانکہ ''میر خوار'' کے زمانے میں بھی اکیلے ''میر خوار'' ہی تھے جنھیں کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ یہ سب ان کی اپنی حرکتوں کی وجہ سے تھا۔ ورنہ ان کے زمانے میں بھی ایک سے ایک ''شیر خوار'' موجود تھے جو جگہ جگہ پوچھے بھی جاتے تھے۔ ''میر خوار'' سے کسی کو دشمنی تھوڑی تھی۔ خود ہم ایک مثال آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ہمارا اپنا تو سارا خاندان ہی ''شیر خواروں'' کا تھا۔ ایک سے ایک جیّد شیر خوار پڑا تھا ہمارے خاندان میں اور ہر ایک دس دس گھروں میں پوچھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود ایسے پھرتا تھا جیسے فاقہ مارہو۔ ''میر خوار'' کی طرح پھر بھی نہیں پھرتا تھا۔ بالکل ننگ دھڑنگ۔ کچھ نہیں تو ''سر پر ٹوپی لال ہاتھ میں ریشم کا رومال'' تو ضرور ہی ہوتا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ہمیں یا ہمارے خاندان کے کسی بھی شیر خوار کو کوئی نہ پوچھتا ہو۔ ہم تو ایک ایک کی جان کو آجاتے۔ ہم سے بڑا شیر خوار تو اس زمانے میں کوئی پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی سالے کا یا تو ابارشن کرا دیتے تھے یا Miscarriage۔

دراصل دیدہ وروں کا زمانہ تو اب شروع ہو رہا ہے اور دھیرے دھیرے ان کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر مارکیٹ میں ابھی تک دیدہ وروں کی کمی ہے۔ اور ان کی جگہ معمولی معمولی ٹٹ پونجئے قسم کے ایم اے، پی ایچ ڈی اور ایم بی اے مزے کر رہے ہیں۔ کیوں؟ اس مارے کہ دیدہ ور ناپید ہیں۔ کیوں؟ اس مارے کہ ابھی تک کسی ایک بھی نرگس نے ہماری بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کرنا شروع ہی نہیں کیا ہے، کیوں؟ اس مارے کہ ان کا ایمان کمزور ہے اور حکومت کی طرف سے ان کی ہمت شکنی کی جا رہی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ برف

بس پھر کیا تھا۔ دے چکّر پہ چکّر۔ دے چکّر پہ چکّر۔ ہر مہینے دو جوتے خریدتے تھے۔ ایک یونیورسٹی آنے جانے کے لیے دوسرا کیلاش ہاسٹل کے چکروں کے لیے۔ کچھ دن بعد ایک ہی خریدتے تھے، صرف کیلاش ہاسٹل کے لیے۔ یونیورسٹی آنا جانا ننگے پاؤں یعنی سائیکل پر ہو جاتا تھا۔ چپل الگ سے خریدنے پڑتے تھے۔ کیونکہ جوتوں کی چوٹ سیٹپک ہوتی ہے۔ وہ ہم گھر جاتے ہی چھپا کے رکھ دیتے تھے اور چپل والد صاحب کے پاس بالکل ان کے قریب ہی تا کہ انھیں زیادہ زحمت نہ ہو۔ آدھے سے زیادہ وقت انھیں چکروں میں گزرتا تھا۔ کیلاش ہاسٹل کی لڑکیاں ہمیں دیکھتے ہی گنگنانا شروع کر دیتی تھیں:

انھیں چکروں میں پڑ کے اگر آسکو تو آؤ

مگر علامہ تو ویسے بھی رقیق القلب انسان تھے۔ بیگم کے علاوہ کسی اور خاتون کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ خصوصاً نرگس کو تو ایک منٹ بھی روتے ہوئے دیکھ لیتے تو ہنستے ہنستے ان کے پیٹ میں بل پڑ جاتے اور وہ بے ہوش ہو کے سر کے بل گر جاتے۔ کیونکہ نرگس روتے میں کچھ اس طرح منہ بسورتی ہے کہ اچھے خاصا چہرہ بالکل بلّی کی طرح بن جاتا ہے۔ اس کا چہرہ ہے بھی کتابی۔ کتاب بھی وہ جس پر بنئے بہی کھاتہ لکھتے ہیں یعنی چپٹا اور لمبوترا۔ ذرا تصور کیجیے۔ بہی کھاتے والا کتابی چہرہ بلی کی طرح منہ بسورے گا تو کیسا لگے گا۔

ہماری اپنی خاتون اوّل (بعد کی تین خواتین گھر میں آنے کی حسرت ہی میں رہیں۔) بھی تقریباً اسی طرح منہ بسورتی ہے اور رونے سے پہلے ہی اس کا نچلا ہونٹ، اونٹ، بلکہ اونٹنی کے ہونٹ کی طرح لٹک جاتا ہے۔ رونے کے دوران اوپر کا بھی۔ رو چکنے کے بعد دونوں ہونٹ پھر سے اپنی اصلی حالت میں واپس آجاتے ہیں۔ گویا اونٹنی ایک کروٹ بیٹھ جاتی ہے۔ چنانچہ جب بھی ہمارا موڈ کئی کئی دن خراب رہتا ہے تو ہم ایک شاعر کا بتایا ہوا نسخہ استعمال کرتے ہیں کہ:

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
اپنی ہنستی ہوئی بیوی کو رلایا جائے

دائی Whoever Comes Earlier کا ہاتھ ہوتا ہے۔ خود ہمارے خاندان میں انڈے کا رواج ختم ہونے کے بعد صدیوں سے یہی رواج ہے۔ کوئی ایک بھی شخص نہ تو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر پیدا ہوا اور نہ اللہ رکھی دائی کے ہاتھ کے بغیر۔ اللہ بخشے اللہ رکھی کے ہاتھ میں بڑی صفائی بھی ہے اور بڑی برکت بھی۔ اکثر دو دو تین تین بھی ہوئے۔ ایک سے کم تو کبھی ہوا ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ کبھی کوئی آدھا پونا نہیں ہوا۔ آدھا پونا اگر ہوا بھی تو کسی نہ کسی کی گود میں چڑھا ہوا یا اس کے سینے پر سوار۔ مطلب ڈیڑھ پونے دو یا ڈھائی پونے تین۔ اللہ رکھی دائی بھی اس بات کی ''داعی'' ہے کہ اسے ہماری خاندانی دائی ہونے کا شرف حاصل ہے اور اس کا یہ دعویٰ درست ہے۔ ہم نے خود اپنے خاندان کے ''رجسٹر برائے اندراجِ پیدائش'' سے اس بات کی تصدیق کی ہے۔ ہمارے دادا پردادا، ان کے دادا پردادا، ان کے بھی دادا پردادا بلکہ نرگس کے رونا شروع کرنے سے بھی ہزاروں سال پہلے سارے بزرگوں کے نام کے آگے اللہ رکھی دائی کا نام لکھا ہوا ہے۔ جب سے دنیا یا یہ رجسٹر بنا ہے Whichever is Later اس وقت سے ہماری پوتی اور پوتے کی پیدائش تک یہ اندراج ہوتا رہا ہے ورق کے ورق پلٹتے جایئے (چاندی کے ورق چھوڑ کر کیونکہ یہ خالی نشانی کے لیے استعمال کیے گئے ہیں اور پلٹنے سے ''پھٹ'' سے پھٹ جائیں گے) ہر نام کے آگے پہلے خانے میں یعنی ''حسب مرضی ومنشا'' والے خانے میں اللہ تعالیٰ کا نام اور دوسرے یعنی ''بدستِ مبارک'' کے خانے میں اللہ رکھی ملے گا۔ حسب مرضی ومنشا کے خانے میں تو اکثر جگہوں پر نام مختلف ہے مثلاً کہیں خداوند کریم ہے کہیں اللہ تبارک وتعالیٰ، کہیں رب العزت کہیں کہیں غفور الرحیم۔ کہیں باری تعالیٰ اور کہیں پروردگار عالم یا مالک یوم الدین وغیرہ وغیرہ مگر ''بدست مبارک'' والے خانے میں ہر جگہ اللہ رکھی کا نام ہی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اللہ رکھی کا تعلق ہمارے خاندان سے ہوتا تو اس رجسٹر میں اس کی پیدائش کا خانہ بھی ہوتا (جو اتنا خراب نہ ہوتا جتنا ہمارا خراب ہوا ہے) اور اس کے آگے بدست مبارک والے خانے میں بھی اللہ رکھی ہی کا نام ہوتا۔ گویا ''میں ہی اپنی منزل'' کی ''راہبر بھی راہی بھی''

میں اس سے زیادہ ہی پیش آئے گی۔ ہمیں عام انسان کو پیش آنے والی مشکل کا اندازہ نہیں کیونکہ ہم کبھی عام انسان کی طرح پیدا نہیں ہوئے۔ ویسے تو دیدہ ور کی طرح بھی پیدا نہیں ہوئے۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ خدا دیکھا نہیں تو عقل سے تو پہچانا ہے۔ یا دیگ کا ایک ہی چاول دیکھ کے ساری دیگ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ کئی دیدہ ور پیدا ہوتے ہوئے تو دیکھے ہیں۔ کتنی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں اس کا تھوڑا بہت اندازہ تو ہے ہی۔ بس:

صورت ببیں حالت مپرس

والی کیفیت ہوتی ہے۔ اور چمن میں تو ایک عام انسان کی پیدائش میں بھی زیادہ ہی مشکل پیش آتی ہوگی کیونکہ کسی بھی ماڈرن سے ماڈرن چمن میں وہ تمام سہولتیں اور پیدائش کے لیے ضروری ''آلاتِ کشاورزی'' دستیاب نہیں ہوتے جو ایک معمولی سے معمولی زچہ خانے میں بھی مل جاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ ڈیلیوری (Delivery) کے لیے کوئی لیبر روم تک نہیں ہوتا اور ساری 'لیبر' ایک اوپن ایئر (Open Air) تھیٹر کے طرز پر بنائی ہوئی 'لیبر جھاڑی' میں انجام دی جاتی ہے جس کے اوپر سے تمام طائران چمن بشمول طائر لاہوتی بار بار نیچی پروازیں کر کے رہی سہی Privacy کا بھی پردہ چاک کرتے رہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے چمن والوں سے متعلق علامہ کا اپنا کوئی تلخ تجربہ رہا ہوگا جس کی ایک بار انھوں نے دبے الفاظ میں شکایت بھی کی تھی اور سارے ہی چمن والوں کو لٹیرا قرار دے دیا تھا۔

اڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

حالانکہ اس سے پہلے علامہ خود ایک بار وہاں سے ایک اچھا سا طوطی 'اڑا لائے'' تھے اور بڑی محنت سے اسے ''سکھا پڑھا'' کے چھوڑ دیا تھا۔ یہ طوطی خود بھی بہت ذہین تھا۔ چند ہی دنوں میں خوب چل نکلا۔ ایک وقت تو ایسا آ گیا تھا کہ چمن میں ہر طرف علامہ کا ہی طوطی بولتا تھا اور اتنا انٹ شنٹ اور اوٹ پٹانگ بولتا تھا کہ ایک ایک کی بولتی بند کر دی تھی۔ اللہ! اس قیامت کا شور مچاتا تھا کہ نقار خانے کی آواز بھی سننے کے لیے کان اور سمجھنے کے لیے دل لگانا

سی بدلوالی تھی۔ اب اسے ہماری صورت سے ڈر لگتا تھا کہتی تھی کہ ''سرکس کے شیر کی سی لگتی ہے'' ہم نے کہا ''اب دوبارہ نہیں بدلوا سکتے۔ اسی میں پندرہ سو ڈالر خرچ ہو گئے۔ تمہارے تو مہر بھی اتنے نہیں بندھے تھے بلکہ آدھے سے زیادہ تو کھلے ہوئے ہی تھے۔ اب کچھ دن تک پیار سے دیکھنا چھوڑ دو۔ رفتہ رفتہ عادی ہو جاؤ گی۔'' اور اس نے واقعی چھوڑ دیا۔ نہ صرف پیار سے بلکہ غصہ سے بھی دیکھنا چھوڑ دیا۔ چنانچہ اس کی دیکھا دیکھی ہم نے بھی چھوڑ دیا۔ نہ صرف شیر کی نظر سے بلکہ بری نظر سے بھی۔

جہاں تک فیض صاحب کو چمن والوں کے مشورہ کا تعلق ہے اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ ایک زمانے میں ''چمن'' نام اس قدر مقبول ہو گیا تھا کہ لوگوں نے فیشن سا بنا لیا تھا۔ بلکہ چمن کے ساتھ ''گلستان''، ''گلشن'' اور ''گلزار'' تک رکھنے لگے تھے۔ ڈاکیے تک پریشان تھے کہ کس کا خط کہاں پہنچائیں۔ جس کو دیکھو۔ گھر مکان، کوٹھی، فلیٹ، اپارٹمنٹ، کوارٹر، جھونپڑی، جھگی، کھولی، چال حد یہ کہ گھونسلے تک کا نام ''چمن زار''، ''گلزار تمنا''، ''گلستان آرزو''، ''بازیچۂ اطفال چمن'' اور اللہ جانے کیا کیا کہنے لگا تھا۔ ایسے ایسے جانور جن کا چمن ہی سے نہیں بلکہ گلچیں، صیاد اور قفس تک سے کوئی تعلق نہیں تھا اپنے گھر کو ایسا ایسا نام دے رہا تھا جن کے معنی تک اسے معلوم نہیں تھے۔ مثلاً ''خمیازۂ چمن''، ''طرۂ گلزار''، ''احتیاج خانۂ گلشن'' وغیرہ۔ ایک کے گھونسلے پر لکھا تھا:

چمنستان بیا، خوش آمدید

کسی کے پڑوس میں بھی کوئی کلی کھل جائے خواہ دل ہی کی کلی کیوں نہ ہو۔ کسی کے کھیت میں گوبھی کا پھول بھی پیدا ہو گیا۔ یا کوئی ویسے ہی پھول کے کپا ہو گیا۔ اس کو بھی چھوڑیے۔ مولی کے کھیت والا بھی اپنے کھیت کو مولی کا چمن کہنے پر اڑا ہوا تھا۔ اور لوگوں کو چڑانے کے لیے جان جان کے یہ گنگناتا تھا:

بوئے جوئے مولیاں آید ہمیں

اس جاہل سے نہ تو کوئی یہ پوچھتا تھا کہ مولیوں میں سے کون سی جوئے شیر نکلتی ہے

قلابے ملا کر ''ارض'' اور ''سما'' نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیے۔ ان میں سے کوئی نکال لو۔ ہم نے کافی غور وفکر کے بعد دو نام نکالے ''بیت الارض'' اور ''بیت السماء''۔ استاد نے ہماری پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دی۔ ہماری بدنصیبی کہ فیض صاحب کو ایک بھی پسند نہ آیا۔ ہم نے تیسرے نام کے لیے فکر کرنی شروع ہی کی تھی کہ امریکہ آنا پڑ گیا۔ اس سے پہلے ہم نے کبھی کسی بات کی اتنی فکر نہیں کی تھی۔ مگر اس بار یہ فکر ہمارے دل کو لگ گئی۔ اور ہم نے یہ سوچنا شروع کیا کہ آخر زمین اور آسمان کے درمیان میں بھی تو کچھ ہوتا ہوگا۔ اسی زمانے میں وہائٹ ہاؤس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں بیٹھ کر دنیا بھر کے لیے خیالی پلاؤ، مطلب خلائی منصوبے تیار کیے جاتے ہیں۔ مصنوعی سیارے خلا میں بھیجے جاتے ہیں۔ اکثر Space Shutes بھی اسی خلا میں جا کر تباہ ہوتے ہیں۔ اسی وقت ہمارے ذہن میں تیسرا تاریخی نام آیا اور جیب سے قلم اور نوٹ بک نکال کر لکھ لیا:

''بیت الخلاء''

جس عمارت میں بیٹھ کر اتنے بڑے بڑے لوگ خلائی منصوبے بناتے ہوں اس کا اس سے بہتر نام کوئی نہیں ہوسکتا۔ ہم نے فیض صاحب سے معذرت کی اور وہائٹ ہاؤس کی دیوار پر چپکے سے یہ نام لکھ کر بگٹٹ بھاگ لیے:

''بیت الخلاء'' ہے نا کتنا پیارا نام؟

ہم کبھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں کرتے جس کا ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہو یا جس کے ''بچشم خود'' عینی شاہد نہ ہوں۔ اکیلی نرگس کے رونے سے کوئی دیدہ ور ہی کیا چڑیا کا بچہ تک ''پیدا نہ ہونے'' کے ہم عینی شاہد رہے ہیں۔ بلکہ اب تک ہیں۔ اس لیے ہمارا ان دونوں ''مخلوقات'' کے بارے میں دعویٰ سچا ہے۔ مگر کیونکہ ہم ابھی تک ''آدمی کا بچہ'' پیدا ہونے کے عینی شاہد نہیں ہوئے ہیں۔ اس لیے ہم نے کبھی اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا ہے۔ حالانکہ آدمی کا بچہ پیدا ہونے کے لیے نہ تو کسی دعویٰ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی عینی شاہد کی۔ عینی شاہد کی ضرورت تو اس وقت پیش آتی ہے جب عینی شاہد کا بچہ پیدا ہو رہا ہو۔

کچھ تو امن ہوگا۔ میرا بس چلے تو جس عورت کو بھی مرد کو جنم دیتا ہوا دیکھوں، قسم خدا کی اسے گولی ماردوں اور اس کے چہیتے نومولود کو دیوار سے پٹخ دوں۔ مجھے تو کبھی موقعہ نہیں ملتا۔ اگر ایک دن کے لیے بھی حکومت مل جائے تو اللہ قسم ایسا قانون بناؤں کہ کوئی بھی عورت سال میں ایک سے زیادہ مرد کو جنم ہی نہ دے سکے۔ صرف ایک مرد۔ مگر صحیح معنوں میں مرد ہو۔ یعنی مردِ حق۔ اور جیسے ہی وہ اسے جنم دینے میں کامیاب ہو جائے اسی وقت اس کی ایسی نس بندی کرادوں کہ سالی زندگی بھر مرد بچے کا منہ ہی نہ دیکھ سکے۔ تڑپ تڑپ کے مر جائے مگر کسی مرد کو یعنی مکمل مرد کو جنم نہ دے سکے۔ بس ہیجڑوں اور نامردوں کو جنم دیتی رہے۔ جتنی مرضی آئے۔ دیکھتا ہوں کہاں تک جنم دے گی۔ ویسے تو اب خود عورت بھی ہر آدمی کی ایک مجبوری بن گئی ہے۔ عورت کے بغیر کوئی بھی آدمی، خواہ وہ کیسا ہی تیس مارخاں یا طرم خاں کیوں نہ ہو، آدمی کا بچہ تک پیدا نہیں کرسکتا۔ یعنی اصلی آدمی۔ صرف صورت شکل والا آدمی نہیں۔ صورت شکل سے آدمی کا بچہ لگنے والا ہر بچہ، آدمی کا بچہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اکثر بندر کے بچے بھی صورت شکل سے بالکل آدمی کا بچہ لگتے ہیں۔ کم از کم آدمیوں کو۔ بندروں کو وہ بھی بندر ہی کے بچے لگتے ہیں۔ جہاں تک بیوی کا تعلق ہے، کبھی کبھی بندر کی بیوی بھی آدمی کی بیوی لگتی ہے۔ اور کبھی کبھی آدمی کی بیوی، بندر کی بیوی۔ ایک تو میک اپ سے پہلے دوسری میک اپ کے بعد۔

اصل میں جس وقت ہم نے پہلی بار علامہ کا وہ شعر پڑھا تھا جس میں انھوں نے دیدہ ور کے پیدا ہونے کا ایک غیر فطری (Un-Natural)، غیر سائنسی (Un-Scientific)، غیر صحت مند (Un-Hegenic)، ناقابل عمل (Un Practical)، ناقابل یقین (Un Believable)، ناقابل فہم (Un Understandable) اور پیچیدہ (Complicated) فارمولا بتایا تھا اسی وقت اپنے دونوں اعتراضات ریکارڈ کرادیے تھے۔ ''ہزاروں سال'' والی شرط پر تو وہ خود ہی شرمندہ سے تھے اور کہتے تھے کہ ان کے اپنے خاندان میں بھی کسی شخص کی عمر ہزار سال تک نہیں

ساتھ کوئی بھی دوسرا فرد ضرور روئے تو ہزاروں سال کی پابندی ختم کر دی جائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی علامہ نے ان شرائط کا اضافہ کر دیا کہ نرگس کے ساتھ دوسرا رونے والا کم از کم ایک ہو اور لازمی طور پر جنس مخالف سے تعلق (جائز) رکھتا ہو۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز تو کر سکتے ہیں مگر با ہم رو نہیں سکتے، بالخصوص دیدہ ور پیدا کرنے کے مقصد سے (اس زمانے میں تبدیلی جنس کا رواج شروع نہیں ہوا تھا) بطور خاص یہ وضاحت بھی کر دی گئی تھی کہ ہزاروں سال ختم ہونے والی شرط اسی وقت سے موثر (Effective) ہوگی جب سے نرگس کا ''ہم گریہ'' اس کا شریک گریہ یا شریک زندگی ہوگا Whichever is earlier۔ اس کے ساتھ ہی وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا، یعنی یہ کہ تنہا نرگس کے رونے سے کچھ بھی پیدا نہیں ہو سکتا، نرگس کے بھی سمجھ میں آ گئی اور اس نے سنیل دت کو نہ صرف اپنا شریک زندگی بلکہ ''شریکِ آہ و زاری'' بھی بننے کی دعوت دے دی تھی۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

ہمارا خیال ہے کہ شادی سے پہلے ہی نرگس نے سنیل دت کو اپنا ''مجازی'' خدا سمجھ لیا تھا۔ اور اسے عندلیب کہنا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ ہندو دھرم اور بھارتی بلکہ ''دت بھارتی'' سماج میں کوئی بھی پتی ورتا استری اپنے پتی کا نام ''برائے نام'' بھی نہیں لے سکتی جبکہ پرائے پتی کی ہر چیز لے سکتی ہے خواہ برائے نام ہی لے۔ بشمول نام کے۔ اس کے ساتھ ہی وہ صورت حال بھی بدل گئی کہ نرگس کہیں اور روئے اور دیدہ ور ہزاروں میل دور پیدا ہو۔ اب تو نرگس بنفس نفیس سنیل دت کے گھر میں سے بھی تھیں اور ان کی شریک آہ و زاری بھی۔ یعنی جو کچھ بھی ہونا تھا انھیں کے ''بطنِ مبارک'' سے ہونا تھا اور وہیں کے وہیں Then and There۔

سنیل دت کا مزاج بھی کچھ علامہ سے ملتا جلتا تھا۔ جیسا کہ ہم نے ایک جگہ لکھا ہے ''علامہ اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور خاتون کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اور نرگس کو تو ایک منٹ بھی روتے ہوئے دیکھ لیتے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ مگر یہاں تو

شکایت کی۔ اگر نرگس کی جگہ علامہ ہوتے تو یقیناً ''آپ'' ہی کہہ کر مخاطب کرتے۔ مصرعہ چاہے بحر سے گر جاتا مگر خود تہذیب سے نہ گرتے۔ مگر علامہ کی خوش فکری سے ہمیں قوی امید تھی کہ وہ مصرعہ کو بھی بحر سے گرنے سے بچالیں گے بلکہ مصرعہ ہی بدل دیں گے۔

آپ کو اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار ہیں

اس طرح بے زاری کی کیفیت سے نہ صرف بیٹھ کر بلکہ لیٹ کر بھی لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔ بہر حال۔ نرگس کی ڈانٹ کھا کر سنیل دت کے ہوش وحواس جاتے رہے یا یوں کہیں کہ ہوش ٹھکانے آگئے اور اسے احساس ہوگیا کہ دراصل:

یہ درد، دردِ زہ ہے کوئی دردِ سر نہیں
اور نہ ہی کوئی دردِ دل یا دردِ جگر ہے

اب سنیل دت کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ پہلوٹھی کا بچہ چاہتا ہے یا دیدہ ور۔

دراصل اسے پہلوٹھی کا بچہ دیکھنے کی بڑی حسرت تھی حالانکہ وہ خود بھی پہلوٹھی کا ہی تھا اور اپنی حسرت پوری کرنے کے لیے دن بھر آئینہ ہی دیکھا کرتا تھا۔ اور اگر یہی آئینہ کوئی اور دکھاتا تھا تو برا مان جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے گھر میں اپنی سیکڑوں تصویریں پیدائش سے لے کر اب تک کے ہر پوز میں لگائی ہوئی تھیں ان سے بھی ایک آئیڈیا تو ہو ہی ہوگیا ہوگا مگر وہ اس آئیڈیے کے ہی خلاف تھا۔ کسی نے پوچھا کہ اُس آئیڈیے میں کیا خرابی ہے؟ کہنے لگا ہر بار ایک ہی منحوس صورت سامنے رہتی ہے۔ پھر پوچھا کہ ''اتنی بہت ساری منحوس صورتیں آخر کہاں سے لاؤ گے؟'' غصے میں آکر بڑے والے فرشی پنکھے کا رخ ان کی طرف کر کے فل اسپیڈ سے چلا دیا کہ سب تصویریں ہی الٹ گئیں۔ اس موقعہ پر کسی شاعر نے کہا تھا:

الٹی ہوگئیں سب تصویریں کچھ تو ہوا نے کام کیا

اسی موقع پر ایک اور شاعر نے بھی کہا تھا مگر وہ ذرا بے موقع تھا یعنی:

آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اجڑ کے رہ گیا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی شاعر ہر جگہ اور ہر موقعہ پر تیار بیٹھا رہتا تھا اور موقعہ

پڑ جائیں گے۔ پتہ ہے کیا جواب دیا ہے؟ کہنے لگا:

اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

اللہ جانے فریاد سے اس نامراد کی کیا مراد تھی۔ مردود کہیں کا۔ اس بے غیرت کو یہ تک پتہ نہیں کہ دن جتنے بھی تھوڑے ہیں وہ گنے تو جا چکے ہیں اب دوبارہ تھوڑی گنے جائیں گے۔

سنیل دت کو تو ہم نے یہ مشورہ دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ مضبوط کاٹھی کا صحت مند جوان تھا اور جوڈو کراٹے میں بھی ماہر تھا۔ دوسرے یہ کہ اس پر تو پہلوٹھی کے بچے کی صورت دیکھنے کا بھوت سوار تھا۔ ہمارا مشورہ سنتے ہی، ہمیں کھا تو نہیں جاتا، مگر کھا جانے والی نظروں سے ضرور دیکھتا۔ جو ہمارے بے ہوش ہونے کے لیے کافی ہوتی۔ انتقال کرنے کے لیے ویسے بھی ہمیں کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ اور اب جب سے علامہ نے دیدہ ور کی پیدائش کے اپنے فارمولے میں تبدیلی کی تھی اس وقت سے تو خود ہمیں اپنا دعویٰ بھی باطل لگنے لگا تھا حالانکہ ہم بار بار، اور ببانگ دہل آسمان کو اپنے اس عزم صمیم سے مطلع کر چکے ہیں کہ:

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم

(اللہ جانے باطل سے دبنے یا نہ دبنے کے معاملے میں ہمیشہ آسمان ہی کیوں ٹانگ اڑاتا ہے۔ زمین سے اس سلسلہ میں ہمارا کبھی کوئی تنازعہ نہیں ہوا۔ ہاں خود زمین کے سلسلہ میں اکثر ہمارا تنازعہ بھائیوں سے رہتا ہے جو چھوٹی موٹی سر پھٹول کے بعد پرامن طور پر طے ہو جاتا ہے)

جب سے سنیل دت سات پھیرے لگا کر نرگس کے شوہر یعنی عندلیب بن گئے ہیں اور دونوں نے مل کر آہ و زاریاں بھی شروع کر دی ہیں، ان کی چاروں انگلیاں گھی میں ہیں (پانچویں انگلی (غالباً بیچ کی) کسی حادثہ میں کچھ اس صورت میں کام آئی تھی کہ اب صرف گھی نکالنے ہی کے کام کی رہ گئی ہے۔ باقی تین اس کام کی بھی نہیں ہیں۔ چوتھا تو انگوٹھا ہے۔ وہ بھی صرف دکھانے کا ہے یا زیادہ سے زیادہ لگانے کا۔ کیونکہ بیچ کی انگلی بیکار ہو جانے سے

پھرتے۔ آخر کو سنیل دت کے دوست تھے۔ اس کی تمام خصوصیات رکھتے تھے۔ یعنی بہترین دوست اور بدترین دشمن۔ دوست ہو یا دشمن ہر ایک کو دیکھ کر خوش ہونا اور انھیں غم دے کر بھی خوش ہونا۔ انھیں کے بارے میں کسی نے کہا تھا:

غم دیے مستقل

اتنے بھانت بھانت کے دوست ہم نے کسی کے نہیں دیکھے تھے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہی سب کے سب ہمارے دشمن بن گئے تھے۔ دور دور سے لوگ آتے تھے انھیں دیکھنے کے لیے۔ دیکھا آپ نے؟

دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ؟

سنیل دت کے سبھی دوست نرگس کو 'بھابی' کہتے تھے۔ نرگس کی حالت تو ایسی ہوگئی تھی جیسی غریب کی جورو کی۔ وہ تو سبھی کی بھابی ہوتی ہے۔ اس لیے سبھی کا ''بھابی بھابی'' کہتے منہ سوکھتا تھا۔ یہ سوکھے ہوئے منہ دیکھ کر سنیل کے بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ان کے منہ نوچ لے اور:

ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لے

■○■

بجانے لگتا ہے۔ کبھی میز کرسی، کبھی چٹکی تالی، کبھی چمچہ پیالی۔ وہ بھی تو انسان ہی ہے پیالہ و ساغر نہیں ہے کہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔

دنیا بھر میں سب سے بڑا گھنٹہ گھر لندن کا ہے جسے BIG BEN کہتے ہیں۔ امروہے کا گھنٹہ گھر تو دوسرے نمبر پر آتا ہے جسے اس کے اصلی نام سے پکارتے ہیں۔ یعنی گھنٹہ گھر۔ پکارنے پر یاد آیا۔ جب پاکستان بنا تھا تو پنجاب سے آنے والے شرنارتھیوں میں لائل پور کا ایک خاندان بھی امروہہ آکر آباد ہو گیا تھا۔ اس خاندان کے سربراہ ایک روز رات بھر گھنٹہ گھر کے پاس کھڑے ہو کر اسے اس کے اصلی نام سے پکارتے رہے۔ 'گھنٹہ گھر' اوئے گھنٹہ گھر۔ اجی پر اجی سنتے ہو کہ بہرے ہو گئے۔'' مگر ہر بار ان کی پکار صدا بہ صحرا ثابت ہوتی رہی۔ یعنی گھنٹہ گھر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر وہ بہت چراغ پا ہوئے۔'' سور دا پتر۔ جواب تک نہیں دیتا سی۔ بے بے ساڈی کرپان کتھے اے۔ ایس دی تو بھین دی...'' کسی نے صبح کو انھیں بتایا کہ ''سردار جی۔ یہ گھنٹہ گھر بڑوں کو جواب نہیں دیتا۔ آپ اس کے بڑے ہیں نا۔ کیونکہ آپ لائل پور کے گھنٹہ گھر والے ہیں۔'' تب جا کے ان کے پاؤں کا چراغ بجھا۔ یعنی غصہ ٹھنڈا ہوا۔ اس وقت تک ہم امروہہ کے گھنٹہ گھر کو دنیا کا سب سے بڑا گھنٹہ گھر سمجھتے تھے۔ اور اپنے حساب سے بالکل صحیح سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس وقت تک ہم نے نہ تو دنیا دیکھی تھی اور نہ کوئی گھنٹہ گھر۔ کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں دنیا بھر سے لوگ امروہے کا گھنٹہ گھر دیکھنے آتے تھے اور گھنٹوں دیکھتے رہتے تھے۔ کبھی گھنٹہ گھر اور کبھی ایک دوسرے کا منہ۔ اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ گھنٹہ گھر کون سا ہے اور ایک دوسرے کا منہ کون سا اور:

کبھی ہم ان کو، کبھی گھنٹہ گھر کو دیکھتے تھے

جب بھی وہ وطن واپس جاتے تھے تو اپنی اپنی گھڑیوں کا وقت امروہہ کے گھنٹہ گھر سے ملا کر لے جاتے تھے۔ اگر راستے ہی میں کسی کا وقت بدل جاتا تھا تو وہ واپس آکر پھر سے ملا کر لے جاتا تھا۔ ہم تو خیر اس بارے میں کچھ نہیں کہتے، مگر لوگ کہتے ہیں کہ امروہے کا

کے گھر کو آ گئے۔ واپسی پر بہت سے لوگوں نے ہم سے وہاں کے گھنٹہ گھر کے بارے میں مختلف سوال کیے۔ اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ہم نے وہاں کا گھنٹہ گھر نہیں دیکھا تو انھیں بڑی حیرت ہوئی۔ ایک دوست نے تو حیرت کے مارے ہماری پیٹھ پر ایک دوہتڑ مار کے کہا:

''ابے سالے! تو لندن گیا بھی اور وہاں کا گھنٹہ گھر ہی نہیں دیکھا تو آخر تو نے دیکھا کیا، گھنٹہ؟''

''نہیں۔ گھنٹہ وہاں کیوں دیکھتا۔ وہ تو میں یہیں سے دیکھ کے گیا تھا۔''

''یہیں سے کہاں سے؟''

''اپنے اسکول سے اور کہاں سے؟''

''ابے اسکول میں گھنٹہ کہاں ہے۔ پتہ نہیں کیا چیز دیکھ لی ہوگی۔''

''ہے کیوں نہیں۔ وہاں تو دو گھنٹے ہیں۔''

''دو گھنٹے؟ وہ کیوں؟ میں نے تو ایک بھی نہیں دیکھا۔''

''ابے جب تو وہاں پڑھا ہی نہیں تو کیا دیکھتا۔ گھنٹہ؟''

''اچھا وہ دو گھنٹے کہاں ہیں؟''

''ایک برامدے میں۔ ایک ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں۔''

''برامدے والا کون بجاتا ہے؟''

''چوکیدار اور کون؟''

اور ہیڈ ماسٹر کیا بجاتا ہے؟ اپنا گھنٹہ؟

''نہیں۔ وہ تھوڑی بجاتا ہے۔ وہ تو ہیڈ ماسٹر ہے۔''

''پھر اس کا گھنٹہ کون بجاتا ہے؟''

''وہ تو خود ہی بجتا رہتا ہے ٹک ٹک ٹک۔ وہ گھڑی والا ہے نا اس لیے۔''

''برامدے والا گھنٹہ خود کیوں نہیں بجتا؟''

''وہ کیسے بج سکتا ہے؟ وہ تو پیتل کا ہے۔ اسے تو بجانا پڑتا ہے، مونگری سے۔''

''کہنے لگا''اپنی ڈیوٹی بجاتا ہوں اور گھنٹہ۔''

''تو نے اس سے پوچھا کہ اس کی ڈیوٹی کیا بجانا ہے اور گھنٹہ بجانا کس کی ڈیوٹی ہے؟''

''ہاں میں نے پوچھا تھا۔''

''کیا کہنے لگا؟''

''کہنے لگا گھنٹہ۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب گھنٹہ۔''

''ابے یہ کیا گھنٹہ بھر سے گھنٹہ گھنٹہ کیے جا رہا ہے۔''

''ابے گھنٹہ بجانا اور کیا۔''

''اور ڈیوٹی؟''

''ہاں وہ بھی بجانا۔''

''ابے تو پوری بات کیوں نہیں بتاتا؟''

''بتا تو رہا ہوں۔ تو جو بار بار بیچ میں بول کے کنفیوژ کر دیتا ہے۔ خاموشی سے سن نہیں سکتا۔''

''اچھا چل بتا۔''

''ہاں تو میں نے اس سے پوچھا تھا کہ گھنٹہ بجانا کس کی ڈیوٹی ہے؟ کہنے لگا چپراسی کی۔ پھر میں نے پوچھا چوکیداری کی ڈیوٹی تو رات میں بجانی ہوتی ہے، تم دن میں کس کی بجاتے ہو؟ کہنے لگا ہیڈ ماسٹر کی۔ وہ دن ہی میں سوتے ہیں۔''

میں نے پوچھا دن میں؟ اور ہیڈ ماسٹرنی، ان کی بیوی؟''

کہنے لگا''ان کی بیوی ہیڈ ماسٹرنی تھوڑی ہیں وہ تو پرنسپل ہیں گرلز کالج میں۔''

میں نے پوچھا''تم اکیلے ہیڈ ماسٹر کی ہی ڈیوٹی کیوں بجاتے ہو۔ کیا وہ اکیلے سوتے ہیں؟''

کہنے لگا:''اکیلے کیوں سوتے، ہیڈ ماسٹرنی بھی تو ہوتی ہے۔''

کہنے لگا ''جو میں اسکول میں بجاتا ہوں چوکیداری کی۔''

میں نے پوچھا ''اور گھنٹہ؟ وہ کون بجاتا ہے؟''

کہنے لگا ''دونوں۔''

''دونوں کون؟''

کہنے لگا ''میں اور چپراسی۔''

میں نے پوچھا ''گھنٹہ تو اسکول میں ہوتا ہے۔ چپراسی گھر پر کیا بجاتا ہے؟''

چوکیدار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر پوچھا۔

''گھنٹہ تو اسکول میں ہوتا ہے پھر چپراسی گھر پر کیا بجاتا ہے؟ وہ پھر خاموش رہا۔

پھر میں بھی خاموش ہو گیا۔

''تو نے پھر پوچھا ہوتا۔''

میں پھر خاموش رہا۔ وہی بولے چلا گیا۔

ابے بتانا تو نے اس سے پوچھا کیوں نہیں؟

کہہ تو دیا کہ پوچھا تھا۔

''کیا پوچھا تھا؟''

یہی کہ ''جب گھنٹہ اسکول میں ہوتا ہے تو چپراسی گھر پر کیا بجاتا ہے؟''

''تو اس نے کیا جواب دیا۔ کیا بجاتا ہے؟''

''ابے سالے کچھ بھی بجاتا ہو۔ میرے گھنٹے سے۔ گھنٹہ گھنٹہ دماغ چاٹ گیا گھنٹہ بھر سے۔''

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے وہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے کیونکہ پیدائشی طور پر تو ہر شخص ہی جاہل ہوتا ہے جس کے نصیب میں تعلیم ہوتی ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ ویسے ہی حالات پیدا کرتا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تعلیم نصیب میں ہوگی تو اللہ تعالیٰ تعلیم کا شوق دے گا۔ ذہانت دے گا۔ تعلیم یافتہ والدین دے گا۔ ہمارے نصیب میں تعلیم

کے۔علم دنیا،علم دین،علم الحساب،علم الکتاب،علم غیب،سورج، چاند،ستاروں کا علم بشمول فلمی ستاروں کے حتیٰ کہ کالا علم تک حاصل کرلیا محض اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل پر۔مگر جو علم سب سے زیادہ ضروری تھا وہی حاصل نہ کر سکے۔یعنی گالیوں کا علم۔جبکہ آجکل تو یہی علم سب سے پہلے حاصل کیا جاتا ہے۔قدم قدم پر اس کی ضرورت پڑتی ہے۔سارے علم ایک ایک کر کے متروک ہوتے جارہے ہیں جبکہ گالیوں کے علم میں روز بروز ترقی ہوتی جارہی ے۔نہ صرف زندہ رہنے بلکہ مرنے تک کے لیے یہ علم ناگزیر ہوتا رجارہا ہے۔ایک سے ایک نئی نئی گالیاں ایجاد ہورہی ہیں۔کسی شخص کو کس موقعہ پر کون سی گالی دی جائے، یا کسی کی کون سی گالی کا کیا جواب دیا جائے یا اسے برداشت کیا جائے۔گالی دینا ایسا ہوتا جارہا ہے جیسے تلوار کی دھار پر چلنا۔ذرا سی بھی غلط گالی دے دی، یا کسی گالی کا مناسب ردعمل نہیں دیا تو جان چلی جاتی ہے۔گالی اب ہتھیار کے طور پر استعمال ہونے لگی ہے بقول اکبرالہ آبادی:

اکبر ڈرے نہیں کبھی دشمن کی فوج سے
لیکن ''شہید'' ہوگئے بیگم کی ''نوج'' سے

''نوج'' سب سے پہلی گالی تھی جو کسی کو قتل کرنے کے لیے استعمال ہوئی تھی۔اسی کے بعد سے لوگوں نے اس طرف توجہ دینی شروع کی اور دینی مدارس کی طرز پر گالیوں کے مدارس قائم کرنے شروع کردیے۔اس طرح مسجدوں اور امام بارگاہوں میں کافروں کو قتل کرنے کے لیے بموں کے بجائے گالیاں استعمال ہونے لگیں۔ایک بم جس سے ایک کافر ڈاکٹر کو قتل کیا جاتا تھا وہ ہزاروں میں تیار ہوتا تھا۔جبکہ اسی لاگت میں کم ازکم ایک درجن گالیاں تیار ہوجاتی ہیں اور ہر گالی سے کم ازکم دو کافر ڈاکٹر قتل کیے جاسکتے ہیں۔اگر دونوں میاں بیوی ہوں تو ایک بچہ فری میں۔گالیوں کے مدرسے بہت ہی سائنٹفک طریقے سے تعلیم دیتے ہیں اور ایسی ایسی گالیاں سکھاتے ہیں کہ کیسا ہی جید سے جید کافر ہو ایک ہی گالی میں ڈھیر ہوجائے۔اب کسی کو یہ شکایت نہیں ہوتی کہ:

گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

یعنی ہم اسے لکھتے رہیں گے۔ اور اگر اس کے گالی ہونے میں ذرا سا بھی شک ہوا تو ہم ''شک کا فائدہ'' یعنی Benefit of Doubt اسی کو دیتے رہیں گے اور لکھتے رہیں گے۔ خواہ بار بار پکڑے جائیں۔

ہمیں یہ نام ملنے کی بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ کم عمری میں ہی گھر داری کی ذمہ داری ہم پر پڑ گئی۔ گلی کے نکڑ پر ہی کاروں اور اسکوٹروں کی مرمت کرنے کی ایک ورکشاپ تھی جس کے مالک استاد سرفراز تھے۔ ہمارے ایک عزیز نے کام سیکھنے کی غرض سے استاد سرفراز کے پاس پہنچا دیا۔ استاد نے تھانے میں ہمارا نام پتہ لکھوانے کے لیے ہماری تصویر مانگی اور ہمارا نام پوچھا جو ہم نے فوراً بتا دیا۔

معرفت سید محمد امام رضا نقوی امروہوی

محلّہ دانشمندان مکان نمبر 1710/13 نزد بلّو حلوائی و کالونگریز، سبزی منڈی

سے تھوڑا سا آگے الٹے ہاتھ کو دوسری گلی میں۔ امروہہ، ضلع مرادآباد، یوپی، انڈیا

پہنچ کر سید سبط اختر نقوی امروہوی ضلع مرادآبادی کو ملے

استاد نے رجسٹر میں لکھنا شروع کر دیا۔ ابھی ''معرفت'' ہی لکھا تھا کہ ہمیں حیرت سے دیکھا اور ہماری ''گردان'' ختم ہونے تک برابر دیکھتا رہا۔ پھر بولا:

''بس اتنا کافی ہے۔'' اور اپنے ایک مستری کو آواز دی۔

''ابے حرامی۔ یار اس چوتیا کو اپنے ساتھ لگا لے۔'' اور اس ''حرامی'' نے ایسا ہی کیا۔ اپنے ساتھ ہمیں لگا لیا۔ اسی روز سے ہمارا نام ''چوتیا'' پڑ گیا۔

معلوم ہوا کہ استاد نے اپنے تمام شاگردوں کے مختلف نام خود ہی رکھ دیے ہیں۔ کوئی ''جھڑوس'' ہے۔ کوئی ''چپڑ قناتی'' کوئی ''ٹپنکھا'' کوئی ''گھٹ پینڈوا''۔ چنانچہ اس روز استاد نے:

ہمارا نام بھی ''لکھا'' محبت کرنے والوں میں

اگر خدانخواستہ اس وقت ہم نے استاد کو اپنا اتنا لمبا چوڑا نام اس سے بھی زیادہ لمبے

''ہیلو ہاں۔کون بول رہا ہے۔حرامی؟''

''نہیں استاد۔میں ہوں چوتیا۔استاد۱۰روپے پیشگی مل جائیں گے؟ایمرجنسی ہے۔''

''ابے دودن پہلے ہی تو لے چکا ہے۔اچھا گھنٹہ بھر بعد آ کے لے جیو۔''

اپنے نام سے ہم مانوس تو ہو گئے تھے۔اور ہمیں اچھا بھی لگتا تھا۔اس سے مخاطب کیے جانے پر بڑی اپنائیت اور خلوص محسوس ہوتا تھا۔مگراس کے معنی اور مطلب معلوم کرنے کی کرید لگ گئی تھی۔ایک دن ہمت کر کے محلے کی مسجد کے ملاں جی حافظ عبدالغفور سے اس کے معنی پوچھنے پہنچ گئے۔ملاں جی نے بڑی محبت اور احترام سے ہمیں حجرے میں بٹھایا اور اس طرح سمجھایا:

''اصل میں یہ لفظ بذاتِ برا نہیں ہے بلکہ یہ تو بہت اچھے اور سیدھے سادے لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ایسے لوگ جو شریف سیدھے سادے،ایماندار،نیک،سچے،بے غرض،نمازی،پرہیزگار اور لوگوں کے کام آنے والے ہوتے ہیں۔ایسے جو خودغرضی،لالچ، دنیا کے مکروفریب،جوئے شراب اور ہر نشے سے دور ہوتے ہیں۔''ہم نے پوچھا۔

''مگر ملاّں جی یہ کسی کا نام تو نہیں ہوتا جیسے محمد شریف ہمارے ٹیچر ہیں۔نیک محمد اسکول کا چپراسی ہے۔سچے بھائی ہمارے ایک رشتے دار ہیں۔اچھے میاں ہمارا بھتیجا ہے وغیرہ وغیرہ۔مگر چوتیا ہم نے کسی کا نام نہیں سنا۔''ملاّں جی بولے''اگر کسی ایک شخص میں یہ ساری خوبیاں یا ان میں کی کچھ خوبیاں اکٹھی ہوں تو اسے چوتیا کہا جاسکتا ہے مگر ایسا ہوتا کہاں ہے۔کوئی شریف ہے تو جوا بھی کھیلتا ہے۔کوئی نمازی ہے تو شراب بھی پیتا ہے۔کوئی سچا ہے تو لالچی بھی ہے،وغیرہ وغیرہ۔''ہم نے پوچھا۔

''مگر ملاّں جی جو مطلب آپ نے بتایا ہے اس سے تو یہ لفظ بہت اچھا لگتا ہے۔''

''ہاں اچھا تو ہے کیونکہ ان تمام اچھائیوں والے شخص کو ہی تو چوتیا کہا جائے گا۔ مگر جس لفظ سے یہ لفظ بنا ہے وہ بہت گندہ ہے۔گالی ہے۔''

''وہ کیا لفظ ہے ملاّں جی؟''

ہمیں زندگی میں کبھی غصہ نہیں آیا۔ خصوصاً خود کو اس نام سے مخاطب کیے جانے پر تو کبھی غصہ آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اب جب سے اس لفظ کے مطلب اور معنی معلوم ہوئے ہیں تب سے تو اس تخاطب پر خوش ہی ہوتے ہیں۔ مگر ہمیں پہلی بار اس نام سے مخاطب کیے جانے پر اس وقت غصہ آیا جب مخاطب کرنے والی ایک خاتون تھی جس کی وجہ وہی یعنی ہماری نامکمل معلومات تھیں۔ ہم نے اس خاتون سے ایک احمقانہ بلکہ بچکانہ سوال کر لیا تھا جس پر اس نے حیرت زدہ ہو کر صرف اتنا کہا: ''اجی بھائی اتّن، تم تو بہت ہی چوتیا ہو۔''

کسی صنف نازک کی زبان سے ہم نے یہ لفظ پہلی بار سنا تھا۔ حالانکہ وہ خود اتنی نازک نہیں تھی جتنی کی اس کی صنف تھی، مگر اس لفظ کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی نازک تھی۔ اس کی زبان سے یہ لفظ سن کر ہمارا چہرہ غصے کے مارے سرخ ہو گیا مگر:

ہم چپ رہے ہم ہنس دیے

اور صرف اتنا کہا ''بدتمیز، تم نے ہمیں چوتیا کہا۔''

اس نے جواب بھی نہ صرف لاجواب دیا بلکہ ہمیں ہی لاجواب کر دیا۔ دوسرے الفاظ میں ہماری بولتی بند کر دی۔ کہنے لگی ''میں نے ہی ایسا کیا کہہ دیا۔ تمھیں تو ساری دنیا ہی یہی کہتی ہے۔''

اسی وقت ''ساری دنیا'' کے موضوع پر ہمیں اپنے دوست دل لکھنوی مرحوم کا ایک بہت اچھا شعر یاد آ گیا جو ہم نے اسے فوراً ہی سنا بھی دیا:

ساری دنیا کی بات جانے دو
تم نے کیسے کہا کہ سودائی

اصل میں ہم سے اسی وقت تین غلطیاں ایک ساتھ ہو گئیں۔ ایک تو اس قدر برجستہ شعر دوسرے فوراً ہی سنا بھی دیا۔ اور تیسری یہ کہ ''تم نے'' پر کچھ ضرورت سے زیادہ ہی زور دے دیا۔ اتنا زور تو کسی پر بھی دیتے وہ بھی ٹوٹ پھوٹ جاتا۔ بس یہ بات اس کے دل کو لگ

ہو گیا تھا کہ ہم نصف صدی بعد اس اوقات کو پہنچیں گے کہ ہمیں 'گالی' سے نوازا جائے گا اور انھوں نے ''اُسی'' وقت ہمارے ''اِس'' وقت کے حسب حال یہ شعر کہہ دیا تھا بلکہ طور خاص ایک ایسے مشاعرے میں پڑھ بھی دیا تھا جس میں ہم محض اتفاق سے شریک ہو گئے تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ ''مان نہ مان میں تیری مہمان'' اس وقت کہاں تھی۔ وہ تو اس وقت دل لکھنوی ہی کیا خود ہمارے اپنے خواب وخیال میں بھی نہیں تھی۔ واہ رے دل انکل! آپ نے اس شعر میں نہ صرف ہمارے دل کی بات کہہ دی بلکہ ہمارا کلیجہ تک نکال کے رکھ دیا۔ اب کم سے کم کلیجہ تو اس کی اصل جگہ پر واپس رکھ دیتے۔ یوں پڑا پڑا تو ہلتا رہے گا۔ کل کلاں کو کسی اور کو اس کی ضرورت پڑ گئی تو کیا نکالے گا؟ گھنٹہ؟ آج آپ نے نکالا ہے کل کسی جگر مرادآبادی، گردہ الہ آبادی۔ پھیپھڑا امروہوی یا پتہ فیض آبادی وغیرہ میں سے کوئی نکالنا چاہے گا۔ آخر ان کا بھی تو حق ہے۔

جس محلے میں تھا ہمارا گھر وہاں رہتے تھے سب ہی سوداگر۔ مگر ہمیں نہ تو اس محلے سے دلچسپی تھی اور نہ کسی سوداگر یا اس کی کسی ماہ جبیں دختر سے۔ خواہ اس حرافہ کی کہیں شادی ہوئی ہو یا وہ اپنے عاشق کے ساتھ معہ اپنے پاندان اور دیگر تام تو بڑے کے بھاگ گئی ہو۔ ہمیں تو اس گھر سے دلچسپی تھی جس میں ہم رہتے تھے اور اس کے واحد بازار ''اکانومی مارکیٹ'' سے تھی جہاں سے اپنی تمام تر اور خشک ضروریات زندگی پوری کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں وہاں کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ہماری دلچسپی کچھ اس وقت پیدا ہوئی جب خوش نصیبی سے ہمارے ایک ماموں چند روز کے لیے ہمارے گھر آئے۔ خوش نصیبی اس لحاظ سے کہ ہمارے دور قریب کے عزیزوں اور رشتہ داروں میں سے کبھی کوئی بھی ہمارے گھر آ کر جھانکتا تک نہیں تھا۔ حالانکہ ہمارا گھر اس محلے کا واحد گھر تھا جو جھانکنے کے لیے آئیڈیل سمجھا جاتا تھا۔ دور دور سے لوگ آتے تھے جھانکتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ماموں ہمارے واحد قریبی رشتہ دار تھے جو بہت دور سے آئے تھے اور نہ صرف جھانکنے بلکہ چند روز قیام کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ اس لیے اب

سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی ماموں سے۔اس لیے دوپہر کا کھانا لے جا کر ماموں کو پہنچا دیتے تھے اور شام کو دوکان بند ہوتے وقت جا کر انھیں لے آتے تھے۔اتنی دلچسپی ہم نے کسی کو اپنے بیوی بچوں تک سے نہیں دیکھی جتنی کہ ماموں کو گھڑیوں سے تھی۔

ماموں کے بیان کے مطابق گھڑیوں سے ان کی دلچسپی پیدائشی تھی۔اس کی وضاحت ماموں نے اس طرح کی کہ ان کی پیدائش جس لیڈی ڈاکٹر کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، ماموں کی پیدائش کے بعد اس کی کلائی کی گھڑی غائب تھی جو بعد میں ماموں کی مٹھی میں دبی ہوئی ملی۔دراصل اس گھڑی سے ہی ماموں کو یہ معلوم ہوا کہ ان کی پیدائش لیڈی ڈاکٹر کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی کیونکہ ماموں کی مٹھی میں دبی ہوئی گھڑی ''لیڈیز'' تھی۔

ماموں کے کہنے کے مطابق ان کی دلچسپی بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ کوہ نور ہیرے کی بنی ہوئی ایک گھڑی ماموں نے دس میل لمبی ریس میں جیتی تھی۔اس گھڑی کو جیتنا ماموں نے اپنی زندگی کا واحد ''مقصد حیات'' بنالیا تھا۔ماموں کے علاوہ اس ریس میں حصہ لینے والے تمام 'شرکاء' آدھے فاصلے پر ہی گر کر بے ہوش ہو گئے تھے۔صرف ماموں ہی اکیلے رہ گئے تھے جو آخر میں گرے تھے۔مگر ہوش میں تھے۔بے ہوش وہ وکٹری اسٹینڈ پر گھڑی جیتنے کے بعد ہوئے تھے جب انھیں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ گھڑی ''نقلی پیتل'' کی تھی۔

واپسی سے ایک روز پہلے ماموں دن بھر گھڑیوں کی دوکان پر کھڑے رہے۔ہم حسب معمول شام کو انھیں لینے گئے۔ماموں نے دوکان بند ہوتے وقت بڑی ہمت کر کے ایک بہت ہی خوب صورت اور چمک دار گھڑی کی طرف اشارہ کر کے دوکان دار سے پوچھا:

''یہ گھڑی کتنے کی ہوگی؟'' دوکان دار نے ایک چھڑی سے اس گھڑی کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا ''یہ والی؟''

''جی ہاں یہی۔'' ماموں نے جواب دیا۔

سوچا پھر کہا۔ ''نہیں ٹھیک کیوں نہیں رہے گا بلکہ پنڈولم والا گھنٹہ بالکل ٹھیک رہے گا۔ آپ لٹکا کے تو دیکھئے انشاءاللہ دوکان چمک جائے گی۔ ماموں اور ہم تو آپ کے مستقل گاہک ہو جائیں گے۔ کیوں ماموں؟''

ماموں نے ہمارے سر پر ایک دھپ جمایا ''بہت بدمعاش ہو گیا ہے۔ میں تو سمجھتا تھا ابھی تک چوتیا کا چوتیا ہی ہے۔''

■○■

ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ ہمیں یہ ''اعزازِ خصوصی'' حاصل ہے کہ ہمارا ذاتی محبوب، خاندانِ محبوب الٰہی سے ہے یعنی اس خاندان کے سربراہ محبوب الٰہی ہیں۔ محبوب الٰہی نقش بندی (نقش بندی میں 'ق' اور 'ش' کے نقطے لگانے بہت ضروری ہیں۔ اگر غلطی سے یہ نقطے لگنے سے رہ گئے تو باقی چیزیں تو رہ جائیں گی۔ مگر خاندان کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ کیونکہ ان نقطوں کے بغیر نقش بندی کا تلفظ بدل جائے گا۔ اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ ''ق'' اور ''ش'' کے نقطے نقش بندی لکھنے سے پہلے ہی لگا دیے جائیں۔ پھر چاہیں تو نقش بندی نہ بھی لکھیں خالی نقطوں ہی سے کام چل جائے گا اور ہاں کامن سینس سے۔''

محبوب الٰہی نقش بندی کے چار بیٹے ہیں۔ ایوب الٰہی، یعقوب الٰہی، یعسوب الٰہی اور مرغوب الٰہی۔ اور ایک بیٹی ہے، محجوب الٰہی۔ دراصل یہ محجوب الٰہی ہی ہمارا محبوب ہے، جسے ہم کبھی کبھی ''کیا خواب الٰہی'' بھی کہہ دیا کرتے تھے۔ ''تھے'' ہم نے اس لیے کہا کہ اب کئی سال سے ہم اسے کچھ بھی نہیں کہتے۔ بلکہ ہم کچھ کہنے کی پوزیشن ہی میں نہیں ہیں۔ حالانکہ جو محبوب بغیر کچھ کہے سنے ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہو، اسے تو برا بھلا کہنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر:

اپنی تو یہ عادت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے۔ کچھ بھی نہیں کہتے

اگر کچھ کہنا چاہتے بھی ہیں تو ایک ٹھنڈی آہ بھر کے صرف اتنا کہتے ہیں کہ ''ہم کیا کہہ سکتے ہیں'' اور واقعی ایسی صورت میں ہم کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔ یہ تو بہت ہی نازک صورتِ حال ہوتی ہے۔

اسی لیے ہم نے شروع ہی میں یہ دعا مانگی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو محبوب کا غم نہ دے۔ اس میں اتنا سا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگر یہ غم دے تو اسے غلط کرنے کا ایک نسخہ بھی پکڑا دے۔ جیسا کہ ان لوگوں کو پکڑایا ہوا ہے جنھیں اولاد کا غم دیا ہے۔ حالانکہ اولاد کا غم غلط کرنے کے تو بہت طریقے ہیں۔ کیونکہ جنھیں اولاد کا غم ہوتا ہے ان کی تعداد ہی کتنی ہے۔ انگلیوں پر گن لو۔ زیادہ تر لوگ تو کثیر الاولاد ہوتے ہیں، جنھیں دنیا کا ہر غم ہوتا ہے سوائے

کوئی دعا مانگنے کی ہمت ہی نہیں پڑی جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمیں:

یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

پتہ نہیں اللہ تعالیٰ کو ہماری کون سی خوبی یا حرکت پسند آ گئی ہے کہ ضرورت کی ہر چیز دعا مانگے بغیر ہی مل جاتی ہے۔ ہمیں نہ ملے، ہماری بیوی ہی کو مل جاتی ہے۔ ایک ہی بات ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے انتہائی مشکور ہیں۔ اس نے ہمیں ہر چیز میں اس قدر خود کفیل کر دیا ہے کہ کبھی کوئی کچھ دیتا بھی ہے تو قبول نہیں کرتے۔ سوائے خدا کے۔ مانگتے اس سے بھی کچھ نہیں۔ اس لیے مانگنے کی عادت بھی نہیں پڑی ورنہ آج کو بھیک مانگتے پھر رہے ہوتے۔

ادھر کافی عرصہ سے ایک عجیب رواج یہ پڑ گیا ہے کہ ہر شخص جس سے ذرا سی بھی واقفیت ہو، خواہ دعا سلام تک ہی ہو، اللہ حافظ یا خدا حافظ کہہ کر جب مصافحہ کرتا ہے تو ہاتھ دیر تک پکڑے ہوئے، بڑی مسکین سی صورت بنائے یہ درخواست ضرور کرتا ہے:

بس دعاؤں میں یاد رکھئے گا

بعضا بعضا تو اس قدر مسکینی سے ''بس'' کہتا ہے کہ یہ سمجھ میں آتا ہے جیسے 'بد' دعاؤں میں یاد رکھنے کے لیے کہہ رہا ہو۔ ایک آدھ کو ''بد دعا'' میں یاد رکھنے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ یہ 'بد' نہیں 'بس' ہے۔ خدا کرے کہ ''بد'' کے ساتھ والی دعا قبول نہ ہوئی ہو۔

ویسے اس مہنگائی کے زمانے میں، ہمیں اس درخواست میں اتنا فائدہ ضرور نظر آیا کہ اب تمام لوگوں کو صرف دعاؤں میں یاد رکھنے پر ہی بات ٹل جاتی ہے۔ ورنہ ایک زمانے میں ایسی ''شاہانہ'' عادت پڑ گئی تھی کہ تقریباً ہر روز چار چھ دوست احباب کے علاوہ دو چار پڑوسیوں اور محلّہ داروں تک کو کھانے پر ''یاد'' کر لیا کرتے تھے۔ اس امید پر کہ شاید ہمیں بھی، کبھی کبھار ہی سہی، اس طرح کوئی یاد کر لیا کرے گا۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہر جمعرات کو تمام پڑوسیوں کے گھروں سے جو کھانا ہمارے یہاں آتا تھا، وہ آتا تو اب بھی ہے، مگر اب سب کے یہاں سے ہر جمعرات کو آنے کے بجائے، ہر جمعرات کو باری باری ایک ایک کے یہاں سے آتا ہے۔ حروف تہجی کے لحاظ سے۔ یعنی ایک جمعرات کو پروفیسر

فاقہ تو بڑے بڑے رؤسا بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمارے بچے غریب تو بالکل ہی معصوم ہیں۔ اگر آپ لوگوں نے ہماری حالت پر ترس نہیں کھایا تو ہم عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ اتنے لوگوں کو فاقے سے مارنے کی بڑی سخت سزا ہے۔''

تمام محلے والوں نے میٹنگ کر کے ایک ٹکا سا جواب لکھ کر ہمیں بھجوا دیا۔ پتہ ہے کیا لکھا تھا لکھا تھا کہ ''مسٹر کاردباری۔ ہر کام میں اپنا ہی فائدہ دیکھنے کی عادت چھوڑو۔ مہنگائی سبھی کے لیے بڑھی ہے۔ کبھی یہ بھی سوچ لیا کرو کہ دوسرے کا بھی دو پیسے کا فائدہ ہو جائے۔ کان کھول کر سن لو۔ بلکہ آنکھیں کھول کر پڑھ لو۔ جمعرات کا کھانا صرف جمعرات ہی کو بھیجا جاتا ہے۔ پیر منگل کو کسی کے گھر فاتحہ نہیں ہوتی۔ فاتحہ کا کھانا صرف جمعرات ہی کو بھیجا جائے گا۔ اتنی سی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا دماغ میں بھیجا بالکل ہی نہیں۔ اگر منظور ہے تو جمعرات سے پہلے بتا دو۔ ورنہ:

اور بھی گھر ہیں ''محلے'' میں ترے گھر کے سوا

پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ سال کے ''معصوموں'' سے کہو محنت مزدوری کریں۔ اب بڑے ہو گئے ہیں، محنت مزدوری کرنے کے لیے اس سے زیادہ بڑے چاہئیں بھی نہیں۔''

دستخط کنندگان میں ریٹائرڈ جسٹس حمید رضوی کا نام دیکھ کر ہمیں تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ شکر ہے کہ زہریلا نہیں تھا بلکہ کوئی پالتو قسم کا تھا۔ ایسے سانپوں کی نسل اب ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ بس آستینوں میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ پوری نسل نہیں ایک آدھ سانپ۔

ایک تو ہمارے ملنے والوں کی تعداد ہی بہت زیادہ ہے۔ پھر ہر ایک کی ضروریات اور خواہشات کی الگ الگ فہرستیں ہیں جن کا یاد رکھنا ناممکن ہے اور خصوصاً انھیں دعاؤں میں یاد رکھنا تو بڑا کارے دارد ہے۔ دعاؤں کی قبولیت کا ایک خاص وقت ہوتا ہے۔ اگر اس وقت کے اندر اندر دعائیں نمٹ گئیں تو نمٹ گئیں ورنہ آپ کی فہرست کے ختم ہونے کے انتظار میں دراجابت غیر معینہ مدت تک تو نہیں کھلا رہ سکتا۔ پھر تو اس فہرست کی ساری ہی دعائیں قبولیت سے محروم رہ جائیں گی۔ چنانچہ ہم نے اس مقصد سے ایک ایسی دعا تیار کر لی

کوئی بھی بندۂ خدا ہماری دستگیری کو نہیں آیا۔ غصہ تو ہمیں محبوب پر آتا ہے۔ ایک تو بغیر کچھ کہے سنے اچانک ہی چلا گیا اور...

——— ایسا گیا کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا

رسید سے کم از کم اس کا اتا پتا تو معلوم ہو جاتا۔ تلاش کرنے میں کچھ مدد مل جاتی۔ ہم نے تو ہمیشہ ہی اسے محبوب سمجھا۔ بلکہ اپنے سے زیادہ محبوب رکھا۔ اس سے محبت بھی کی تو حقیقی محبت کی۔ دل ہی دل میں اس کی پوجا کرتے رہے۔ محبوب کے بارے میں ہمارا ہمیشہ سے یہ نظریہ رہا ہے کہ محبوب خواہ کسی کا بھی ہو، وہ کھیلنے کی چیز نہیں ہوتا۔ بلکہ کھلانے کی چیز ہوتا ہے۔ کھلانے پلانے کی چیز۔ اس کی تو ہر چیز پیاری ہوتی ہے۔ مجنوں کو تو لیلیٰ کا کتا بھی پیارا تھا۔ شکر ہے ہمارے محبوب کے پاس کوئی کتا نہیں تھا۔ کتے سے ہمیں بہت گھن آتی ہے۔ اسی وجہ سے کبھی امریکی محبوب نہیں رکھا۔ ہمارے محبوب کے پاس ایک بلی تھی بالکل خارش زدہ۔ مگر ہمیں وہ بلّی بھی بمعہ اس کی خارش کے پیاری تھی۔ کیونکہ وہ ہماری ٹانگوں سے رگڑ کے جب کھجاتی تھی تو ہم دونوں کو بڑا مزہ آتا تھا۔ بلی کو اور ہمیں۔ محبوب پیارا ہو تو اس کی ہر چیز پیاری لگتی ہے۔ خصوصاً محبوب کی مہندی۔ لوگ اپنے محبوب کے آگے ناک رگڑتے ہیں۔ اس کے تلوے تک چاٹتے ہیں۔ ایک بار ہم نے بھی محبوب کے تلوے تو نہیں، ہاں ایک تلوا ہی چاٹا تھا۔ ٹرین میں کچھ اندھیرا سا تھا۔ یہ دکھائی ہی نہیں دیا کہ اسی تلوے میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ بس سارا منہ مہندی سے بھر گیا۔ اور سارا مزہ کرکرا ہو کے رہ گیا۔ بڑی دیر تک تھوتھو۔ آخ تھو۔ کرتے رہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہمارا محبوب نہیں تھا۔ وہ تو فلم پاکیزہ کی ہیروئن تھی مینا کماری۔ جس کے لیے راج کمار نے بڑا اچھا ڈائیلاگ بولا تھا: ''آپ کے پاؤں دیکھے۔ بہت حسین ہیں۔ انھیں زمین پر مت رکھئے گا۔ میلے ہو جائیں گے۔'' بس اسی وقت سے اس کے پاؤں تو کیا، دماغ تک آسمان پر رہنے لگا تھا۔

غصہ ہمیں ان لوگوں پر بھی ہے جو ہمیں آ آ کر الٹے سیدھے مشورے دیا کرتے ہیں۔ ایک نے مشورہ دیا کہ ''دوسرا محبوب کرلو۔ اسلام میں چار کی اجازت ہے۔'' ہم نے کہا

رہے ہوں، ان کی چاپ سے بھی لرز جاتے تھے۔ ان کے گزرنے کی ایک مخصوص چاپ ہوتی تھی۔ خواہ قریب سے گزر رہے ہوں یا دور سے۔ وہی ایک مخصوص چاپ ہر وقت کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ حالانکہ اب تو انھیں گزرے ہوئے مدتیں ہوگئیں، مگر ان کے قدموں کی چاپ۔ خیر دنیا سے گزرنے کی تو کوئی چاپ ہی نہیں ہوتی۔ انسان چپ چاپ گزر جاتا ہے۔ کوئی بھی انسان ہو۔ خواہ کسی کا باپ ہی کیوں نہ ہو۔ مگر ہمارے باپ کی تو بات ہی الگ تھی۔ ہر بات۔ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو ہمدردی کے دو لفظ بھی کہہ دیتا۔ یہ بتا دیتا کہ ہم کیا کریں۔ کہاں جائیں۔ کس کے آستانے پر جا کے سر پھوڑیں۔ جہاں بھی، جس کے در پر بھی جاتے ہیں، وہاں سیکڑوں ہزاروں سر پھوڑنے والے پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ اپنا نہیں تو ایک دوسرے ہی کا۔ ہم ہیں کہ چیختے رہتے ہیں کہ:

"سر پھوڑنے" والے دیکھ "ذرا" ہم بھی تو "کھڑے" ہیں راہوں میں
اور ایسے ایسے سر پھوڑنے والے جو ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے

بلکہ نکالے گئے۔ اور ہم اتنے گئے گزرے ہو گئے کہ نکالے ہوؤں میں بھی شامل نہیں ہو سکتے کہ کم از کم اتنا ہی کہہ سکیں کہ:

گر واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں

ایسے ایسے خود غرض اور لالچی لوگ ہیں کہ ذرا سی جگہ تک نہیں دیتے۔ اتنی کہ ہم بھی دو ایک ٹکّریں مار کے سر پھوڑ لیں۔ اتنا کہ ہمارا محبوب دیکھے تو اس کا دل پسیج جائے۔ اسے ہم پر ترس آجائے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمارا ہی نہیں، سارے جہاں کے محبوب بچھڑ گئے ہوں۔ کیا انھیں کے بچھڑے ہوئے محبوبوں میں سے کوئی ایک آدھ ہمیں نہیں مل سکتا تھوڑی سی دیر کے واسطے۔ صرف غم غلط کرنے کے لیے۔ اور ہمیں تو ایسا کوئی بہت زیادہ غم غلط کرنا بھی نہیں ہے۔ بس ذرا سا۔ اتنا کہ جتنے امتحان میں سوال غلط کیا کرتے تھے۔ یعنی صرف 33% وہ ہمارے فیل ہونے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ باقی کے 67% ہم کرتے ہی نہیں تھے۔ نہ صحیح نہ غلط۔ یہ ہماری Distinction یعنی امتیازی پوزیشن لانے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ یعنی فیل

ٹکرا گیا سر سے سر ہی تو ہے
تڑپے نہ یہ کیوں بندر ہی تو ہے

ہمیں تو ان ٹکریں مارنے والوں میں سے کسی کا بھی، کوئی سا بھی کسی بھی سائز کا محبوب تھوڑی دیر کے لیے بھی مل جائے۔ دور جانے کی بھی شاید ضرورت نہ پڑے۔ ممکن ہے کہ خود بھی یہیں کہیں، انھیں میں بیٹھا ہوا ٹکریں مار رہا ہو، تو اسے کاندھوں پر بٹھائے بٹھائے پھریں اور کہیں بھی لے جا کر پٹک دیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ ہمارا وقت آئے گا تو کوئی ہمیں کاندھا دینے والا بھی نہیں ملے گا۔ خود ہی اپنی لاش کو کاندھوں پر لیے لیے پھریں گے۔ جس طرح آج کل لوگ اپنی سولی اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔ ہم نے تو لوگوں سے سنا تھا کہ سولی پر نیند آجاتی ہے۔ ایک آدھ بار تجربہ کر کے دیکھا اور کامیاب ہوئے۔ بہت اچھی نیند آئی۔ بس جبھی سے طرح طرح کی سولیاں جمع کرنے کا شوق ہو گیا ہے۔ ایک سے ایک رنگ برنگی دیسی، ولایتی۔ ایسی ایسی سولیاں جو کبھی راجاؤں مہاراجاؤں، نوابوں، جاگیرداروں تک کو نصیب نہیں ہوئیں، ہمارے گھر میں موجود ہیں۔ دور دور سے آتے ہیں لوگ یہ سولیاں دیکھنے کے لیے اور ہمیں کچی نیند سے جگا کر ان سولیوں کی زیارت کر کے چلے جاتے ہیں۔ بہت خوب:

ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

ہمارے ''گھر میں'' سے چاروں کی چاروں مستقل طعنے دیتی رہتی ہیں کہ:

''گھر میں ہمارے سونے کے لیے جگہ نہیں ہے اور صاحب بہادر نے اپنے سونے کے لیے سیکڑوں سولیاں جمع کر رکھی ہیں۔ عجیب شوق ہے۔ ہمارا مشورہ مانو۔ یہ سب سولیاں بیچ کے ایک سولی صرف ایک بنوالو۔ خالص سونے کی۔ سنگل بیڈ۔ ڈبل کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں اٹیچڈ باتھ روم کے ساتھ۔ بس اسی پر لٹک کے سو جا۔ اللہ کا نام لے کے۔ انشاء اللہ ایسی نیند آئے گی کہ پھر کبھی جاگنا نصیب نہیں ہوگا۔

■○■

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

یا

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

یا

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ بے کس پہ کرم کیجیے سرکارِ مدینہ

اسی طرح کے سیکڑوں شعر جن کے دونوں مصرعے ان شعروں کے نہیں ہوتے، مجھے یاد ہیں اور میں ان سے کوئی نہ کوئی مطلب نکال لیتا ہوں۔ میری اس بھلکڑ پنے کی عادت اور ہر شعر کا کوئی نہ کوئی الٹا سیدھا مطلب نکال لینے کی وجہ سے میرے احباب مجھے ''مطلبی'' کہنے لگے ہیں۔ ایک دوست تو اس قدر جوش میں آ گئے تھے کہ ''مطلبی فرید آبادی'' کہنے لگے تھے۔ میں نے انھیں ایک بار ٹوکا کہ ایک تو ''مطلبی فرید آبادی'' صاحب کی میں بہت عزت کرتا ہوں۔ دوسرے ان کا نام ''مطلبی نہیں بلکہ ''مطلبی'' ہے۔ چنانچہ ان حضرت نے اس کے بعد سے مجھے مطلبی مراد آبادی کہنا شروع کر دیا۔ گو کہ مراد آباد، امروہہ تحصیل کا ضلع ہے۔ مگر اپنی بہت سی خصوصیات اور علما، فضلا ادبا اور دانشوران کی وجہ سے امروہہ مراد آباد سے کہیں زیادہ مشہور ہے اور قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے ان دوست کو پھر ٹوکا کہ مراد آباد تو صرف جگر مراد آبادی اور برتن مراد آبادی کی وجہ سے مشہور ہے مگر امروہہ کی تو مجھ سمیت سیکڑوں چیزیں مشہور ہیں۔ اگر کسی مقام سے نسبت ہی ظاہر کرنا مقصود ہے تو امروہوی کہہ دیا کرو۔ چنانچہ وہ مجھے مطلبی امروہوی کہنے لگے۔

اگر دیکھا جائے تو اس دنیا میں مطلبی کون نہیں ہے۔ ہر شخص ہی مطلبی ہے۔ میں تو علامہ کے اشعار کو غلط پڑھ کر ان کا کوئی نہ کوئی مطلب نکالتا ہوں۔ مگر یار لوگوں نے تو نہ صرف ان کے اشعار سے کئی کئی مطلب نکالے بلکہ خود علامہ کو بھی اپنا اپنا مطلب نکالنے کے لیے استعمال کیا۔ علامہ اقبال ہی کیا لوگ تو اللہ تعالیٰ سے بھی اپنے اپنے مطلب نکالتے ہیں۔ کتنے ہیں جو بغیر کسی مطلب کے اس کی عبادت کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے مطلب

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

میں ہمیشہ اسے ایک ہی جواب دیتا ''یار مست قلندر میں نے تجھے بتایا ہے کہ میں برسوں لکھنؤ میں رہا ہوں اور وہیں اپنی تمام تعلیم مکمل کی ہے۔ وہاں کی تہذیب اور روایات میرے مزاج میں پوری طرح رچ بس گئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ دونوں قسم کے لوگوں سے اس لیے جھک کر ملتا ہوں کہ اس سے میرا حساب برابر ہو جاتا ہے۔ کوئی فائدہ نہیں ہے تو نقصان بھی نہیں ہے۔'' مست قلندر یہ سن کر ہنس دیتا تھا۔ ''سبط بھائی واقعی آپ بالکل اکاؤنٹنٹ ہی ہیں مگر یہ حساب برابر کیسے ہوتا ہے؟''

''دیکھو مومن بھائی'' میں اسے سنجیدگی سے جواب دیتا۔ ''سیدھی سی بات ہے۔ غیر کے آگے جھکنے سے تن میرا رہتا ہے اور نہ من۔ یہ نقصان ہوا نا؟''

''ہاں ہوا تو۔'' وہ جواب دیتا۔

''اور جب اپنے کے آگے جھکتا ہوں تو تن بھی میرا رہتا ہے اور من بھی۔ یہ فائدہ ہوا۔ بس حساب کتاب برابر ہو گیا؟ مست قلندر چکرا جاتا، پھر کہتا۔

''سمجھ میں نہیں آیا سبط بھائی۔ آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ آدمی اگر ایک بار بھی اکاؤنٹنٹ ہو جائے تو زندگی بھر اکاؤنٹنٹ ہی رہتا ہے اور مستقل ننانوے کے پھیر میں پڑا رہتا ہے چاہے بعد میں ترقی کرتے کرتے ہیڈ کلرک ہی ہو جائے یا ہیڈ ماسٹر۔''

دراصل میرے اندر ہر شخص سے جھک کر ملنے کی عادت بچپن ہی سے کیا پیدائش ہی سے ہے۔ اماں کے کہنے کے مطابق بلکہ ان سے بھی زیادہ باوثوق ذریعہ یعنی عینی شاہد (Eye-witness) اللہ رکھی دائی کے بقول میری پیدائش جھکی ہوئی حالت میں ہوئی تھی۔ اللہ جانے اس سے اللہ رکھی کی کیا مراد تھی۔ میں جھکا ہوا تھا، اماں جھکی ہوئی تھیں یا اللہ رکھی دائی ہم دونوں پر جھکی ہوئی تھی۔ اب تو خیر نہ اماں حیات ہیں اور نہ اللہ رکھی۔ بس یہ خاکسار جیسا بھی ہے آپ کی خدمت میں حاضر بلکہ حاضر و ناظر ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ سات

مگر ایسا نہیں تھا۔ ایک تو مجھے اس طرح جھکے رہنے میں بڑا مزہ آرہا تھا۔ دوسرے اس بار خلافِ معمول دیر بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ داداجان کے کہنے کے مطابق تقریباً پون گھنٹہ ہوگیا تھا۔ بس اس وقت سے صرف اتنی ہی بار اور اتنی ہی دیر تک بجاتا تھا جب تک داداجان بجاتے تھے۔ مگر میں داداجان والا انداز کبھی نہیں سیکھ سکا تھا۔ اسے سیکھنے کے لیے میرے پاس نوابین اودھ کا مخصوص دودھ کھلا انگرکھا اور چوڑی دار تنگ پاجامہ نہیں تھا جس کے بغیر تسلیمات کا وہ انداز سیکھا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ انگرکھا نہ بھی ہوتا تو چلو شیروانی سے کام چل سکتا تھا۔ مگر وہ مخصوص چوڑی دار تنگ پاجامہ۔ وہ تو اگر ہو بھی تو کوئی شخص خود اپنے طور پر پہن ہی نہیں سکتا۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ ایسا پاجامہ پہننے کے لیے کم از کم چار بیویوں کی ضرورت ہوتی ہوگی جو لکھنؤ کے نوابین کے علاوہ کسی کو رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اور میں تو اس زمانے میں ایک بیوی تک Afford نہیں کرسکتا تھا۔ اور اب جبکہ بیوی Afford کرسکتا ہوں تو پاجامہ Afford نہیں کرسکتا۔ (خصوصاً امریکہ میں تو اگر کوئی شخص دونوں چیزیں Afford کر بھی سکتا ہو تو اسے دونوں بیک وقت رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ یا تو بیوی رکھے یا پاجامہ) پاجامے کے بغیر تو آدمی تسلیمات ہی کیا کچھ بھی بجاتا ہوا عجیب مسخرہ لگتا ہوگا۔ میں نے کبھی تسلیمات بجاتے ہوئے آئینہ نہیں دیکھا۔ اس کے لیے تو کسی قد آدم آئینے کے سامنے جھک کر خود کو ہی تسلیمات بجاؤں تب ہی دیکھ سکتا ہوں۔

ابھی کچھ عرصہ سے تو میں نے کسی بھی شخص کے آگے جھکنا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ اپنے یا غیر بلکہ چھوٹے اور بڑے کا بھی امتیاز کیے بغیر۔ کوئی کتنا ہی تیس مار خاں کیوں نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ دشمن کے آگے بھی ''ٹوٹ سکتا ہوں جھک نہیں سکتا'' کے اصول پر اکڑا رہتا ہوں۔ اسی اکڑ میں کئی بار ٹوٹا بھی۔ اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔

کچھ دنوں پہلے ایک طویل مدت کے بعد لکھنؤ گیا تھا۔ ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھتا تھا۔ سب کچھ بدل چکا تھا۔ میلوں دور تک نیا لکھنؤ آباد ہو چکا تھا۔ مجھے نئے لکھنؤ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پرانے لکھنؤ اور وہاں کے پرانے لوگوں کو دیکھنے کا شوق تھا۔ ایک دن

سامنے لکھنؤ کی تہذیب کا عملی مظاہرہ کر کے بھی دکھانا تھا۔ اس کے بغیر کوئی شخص میرا یقین نہیں کرتا۔

مگر اس وقت تو میں پاکستان یا امریکہ کیا، ہندوستان میں بھی کہیں جانے کی پوزیشن میں نہیں تھا سوائے باتھ روم کے۔ اور وہاں جانے کے لیے یہی مناسب ترین حالت تھی۔ چنانچہ اس حالت کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ مگر حضرت داغ کی طرح جس سے کافی دیر کے بعد اچھوا اور چھٹن نے نجات دلائی۔

اس وقت کے بعد سے اب صرف بیٹھا ہی رہتا ہوں۔ خواہ تسلیمات بجاؤں تالی بجاؤں یا دیگر آلاتِ موسیقی۔ بلکہ بیشتر وقت تو خالی بیٹھا بیٹھا چٹکی بجاتا رہتا ہوں اور اس طرح میرے تمام کام بھی چٹکی بجاتے ہی ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ کام تمام بھی اس طرح چٹکی بجاتے ہی ہو جائے اور میں وقت آخر کی تمام تکالیف سے محفوظ رہوں۔ اتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں کہ اب مزید کوئی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ ہر وقت یہ فکر بھی کھائے جاتی ہے کہ اپنی نماز جنازہ میں کیسے شریک ہوں گا۔ وہ تو بیٹھے بیٹھے ادا نہیں کی جا سکتی۔ ہمیشہ واجب ہی رہے گی جیسے برسوں پہلے کے لیے ہوئے قرضے واجب ہیں۔ زیادہ دیر کھڑا رہنے کی سکت نہیں ہے اور جھکنا تو اب میرے لیے بالکل ہی ناممکن ہو گیا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب بھی ناظم علی خاں کے گھر جاتا تھا تو اس کے دادا جان قبلہ نہ صرف بہت محبت سے ملتے تھے بلکہ رخصت ہوتے وقت کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور دیتے تھے ایک بار بہت خوب صورت سگریٹ لائٹر دیا تھا۔ ایک بار سنہری سگریٹ کیس۔ کبھی کوئی فونٹن پین اور کبھی کوئی اچھی سی کتاب یا فوٹو البم۔ اکثر خیال آتا ہے کہ اس آخری ملاقات پر وہ مجھے تحفہ دینا کیوں بھول گئے۔ میں تو تحفہ کے لالچ ہی میں ان سے ملنے گیا تھا۔ ورنہ ناظم علی خاں سے تو دوسری جگہوں پر بھی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ اس ملاقات پر انھوں نے جس طرح میرے سامنے تسلیمات بجائی تھی وہ میرے لیے کسی تحفہ سے کم نہیں تھی۔ بلکہ ان کے دیے ہوئے تمام تحفوں میں سب سے زیادہ قیمتی تھی اور بہت ہی

لے سانس بھی آہستہ

جس برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے، اگر وہ سچا برہمن ہے۔ یعنی اصلی اور نسلی برہمن، تو وہ خود ہمارے سامنے آ کر بات کرے۔ ہم اس طرح کسی کے کہنے سے اعتبار نہیں کریں گے۔ یوں تو کوئی بھی، کسی کے لیے بھی کہہ سکتا ہے۔ کسی نے برہمن کے لیے کہہ دیا کوئی ملاّ کے لیے کہہ سکتا ہے کہ:

ایک ملاّ نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

خواہ ملا ہو یا کوئی برہمن، ہم پہلے خود اپنا اطمینان کریں گے تب اعتبار کریں گے۔ کیونکہ:

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

یہ برہمن ہے کوئی پروین شاکر کا محبوب نہیں ہے۔

''کہ'' جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا۔

اور ویسے بھی پروین شاکر کسی کے جھوٹ یا سچ بولنے سے لاجواب نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ لاجواب تھی۔ لاجواب ہے اور لاجواب رہے گی۔ وہ اگر لاجواب تھی تو اپنے پاکیزہ خیالات، سچے جذبات اور اچھوتے احساسات کی وجہ سے تھی اپنی جرأت اظہار اور اپنی ندرت فکر کی وجہ سے تھی جس سے وہ اس ظالم سماج اور مردوں کے بے حس معاشرے کے خلاف برسرِ پیکار تھی۔ وہ اپنی شاعری اپنے معصوم حسن اور دلکش آنکھوں کی وجہ سے لاجواب تھی۔ دوسرے یہ کہ ہر برہمن اپنے اصول کا پکا ہوتا ہے۔ عموماً سچا برہمن کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ بالکل اس طرح جیسے جھوٹا برہمن کبھی سچ نہیں بولتا۔ اور ہمیں کوئی اس طرح جھوٹ ہی

ہمارا اس عہد کی تمام شاکر بلکہ ''صابر و شاکر'' پروینوں کو یہ پیغام ہے کہ ''تم صنف نازک ضرور ہو، مگر اتنی بھی نازک نہیں ہو کہ بالکل چھوئی موئی کی طرح ہاتھ لگانے سے بھی مرجھا جاؤ۔ بقول شاعر:

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

تمہیں خدا نے حسن دیا ہے۔ یہ نزاکت کی کلہاڑی تم نے خود اپنے پاؤں پر ماری ہے۔ گویا یہ نزاکت تمہاری خود اختیاری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نہیں ہے۔ اس لیے اس عطیہ خداوندی یعنی ''حسن'' سے فائدہ اٹھاؤ اور ''نزاکتِ خود اختیاری'' کے بجائے ''حق خود اختیاری'' استعمال کرتے ہوئے ہمت سے کام لو۔ تمہارے پاس تو وہ طاقت ہے جس سے تم مردوں کو تگنی کا ناچ نچا سکتی ہو۔ اس کے لیے نہ نو من تیل کی شرط ہوگی اور نہ آنگن ٹیڑھا ہونے کا عذر وہ تو ایسا ناچیں گے کہ کیا کبھی رادھا ناچی ہوگی۔ بالکل پھرکی کی طرح۔ ان مردوں کی دکھتی رگ تو تمہارے ہی ہاتھ میں ہے۔ ایک ہاتھ سے یہ ''رگ'' پکڑو، دوسرے ہاتھ سے ''ہمّت''۔ ایک مرتبہ بس ایک مرتبہ جی کڑا کر کے فیصلہ کرلو۔ سو سال، صرف سو سال۔ یعنی ایک صدی تک، عورتیں پیدا کرنی بالکل بند کر دو اور جس رفتار سے اب تک عورتیں پیدا کرتی رہی ہو، اس سے دوگنی رفتار سے مرد پیدا کرو۔ دے مرد پہ مرد۔ دے مرد پے مرد۔ دیکھنا پچاس سال کے اندر اندر یہ حالت ہو جائے گی کہ جو مرد چار چار شادیاں کر کے چار چار عورتوں کو غلام بلکہ لونڈی بنائے رکھتا ہے، رفتہ رفتہ ایک لونڈی، مطلب ایک بیوی تک کا محتاج ہو جائے گا۔ نہ ہو جائے تو ہمارا نام بدل کے لونڈا رکھ دینا۔ انشاء اللہ کامیابی تمہارے قدم چومے گی اور مرد تمہارے تلوے چاٹیں گے۔ اور سو سال کے اندر اندر ایک وقت ایسا آ جائے گا کہ ایک ایک ''بڑھیا'' کے قدموں میں دس دس ''جواں مرد'' پڑے ہوئے ناک رگڑ رہے ہوں گے کہ ''خدا کے واسطے ہمیں غلامی میں لے لو۔ ہم دس مل کے، بلکہ مل بانٹ کے تمہاری غلامی کریں گے۔'' سو سال کے بعد تو یہ حالت ہو جائے گی کہ آپس میں مرد ہی ایک

بسوں سے کود کے مرنے کے ہم نہیں قائل

ایک تو ہمیں ویسے ہی چلتی ہوئی بس سے اترتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ برسوں پہلے ایک بار جب کہ ابھی بس پوری طرح رکی بھی نہیں تھی' ہم مخالف سمت میں اترنے لگے تھے۔ خیریت ہوئی کہ ابھی بس کا ڈنڈا پوری طرح ہاتھ سے چھوڑا نہیں تھا۔ وہ بھی ہمارے گرنے اور بس کے ساتھ ہی چھوٹا۔ بس کو تو خیر چھوٹنا ہی تھا کیونکہ ہم آخری مسافر تھے جسے اترنا۔ بعد میں جب دوستوں کو اس واقعہ کی تفصیل بتائی تو ایک صاحب نے ہماری کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''ابے تو تو پہلے ہی سے اترا ہوا ہے۔ تجھے بس سے اترنے کی کیا ضرورت تھی۔'' اب ہم کسی کو کیا جواب دیتے۔ اب تو خیر بڑھاپے کی وجہ سے ٹانگوں اور گھٹنوں میں تکلیف رہتی ہے اس لیے کبھی کبھی تو کٹھری ہوئی بس سے اترنے ہی میں نہیں بلکہ چڑھنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ اور اکثر تو بس کنڈکٹر کو کرایہ کے علاوہ ایک آدھ روپیہ بخشش کے طور پر دے کر اس کی خوشامد کرتے ہیں کہ بس کو بالکل رکوا دینا۔ ہمارے گھٹنوں میں تکلیف ہے۔ بعض کنڈکٹر بطور خاص بس رکوا کر بحفاظت بس سے اترنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔

ایک بار ہم نے کنڈکٹر کو کرایہ دیکر اسے بتایا کہ ہمیں فلاں اسٹاپ پر اترنا ہے۔ پیر میں چوٹ لگی ہوئی ہے۔ بس کو بالکل رکوا دینا بڑی مہربانی ہوگی۔ یہ کہہ کر ہم نے چھپا کے کنڈکٹر کے ہاتھ میں دو روپے رکھ دیئے۔ کنڈکٹر نے غصہ میں آکر دو روپے ہمیں واپس کرتے ہوئے کہا۔

ہمیں کراچی کی سڑکوں پر کہیں بھی کوئی بس کھڑی ہوئی نظر نہیں آئی۔ ایسا لگتا ہے کہ بسیں چلتی ہوئی بلکہ بھاگتی ہوئی حالت میں ہی بنائی یا Assemble کی جاتی ہیں۔ اور شاید خریداروں کو بھی اسی حالت میں Deliver کی جاتی ہیں اللہ جانے مسافر لوگ کس طرح چڑھتے اور اترتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بھی Assembling کے دوران میں ہی چڑھا اور اتار دئے جاتے ہوں۔ ہمیں تو کھڑی ہوئی بس میں چڑھنے اور اترنے کا ایک ہی بار اتفاق ہوا تھا جب بے خیالی میں ایک جگہ بس کھڑی ہوئی دیکھ کر بہت آرام سے اس میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔ آدھے گھنٹے تک نہ تو کوئی اور مسافر اس بس میں سوار ہوا اور نہ ڈرائیور اور کنڈکٹر۔ آدھے گھنٹے بعد گریس اور تیل میں چکٹے ہوئے کپڑوں میں ایک مسافر سوار ہوا اور کہنے لگا۔

''استاد اُس کی کلچ پلیٹ بالکل جواب دے گئی ہے۔ نئی ڈال دوں یا کسی دوسری بس کی نکال کے لگا دوں؟''

چنانچہ ہم جس طرح کھڑی ہوئی بس میں سوار ہوئے تھے اسی طرح آرام سے بغیر کسی کی مدد کے اُتر گئے۔

ایک بار تو ہم اسٹاپ پر اُترنے کے لیے بس کے گیٹ پر ہی کھڑے تھے۔ ہمارے پیچھے کنڈکٹر اور اُس کے پیچھے چند اور مسافر کھڑے تھے جنھیں اسی اسٹاپ پر اُترنا تھا۔ ہم اترنے کے لیے بس کے بالکل ٹھہر جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر پیچھے سے نہ صرف کنڈکٹر بلکہ باقی کے بے صبر سے مسافر بھی چلا رہے تھے۔

''اماں جلدی کرو سوچ کیا رہے ہو۔'' ہمیں ان لوگوں کے سامنے شرمندگی بھی ہو رہی تھی۔ مگر مجبوری تھی ہم نے کہا کہ بھئی ہم چلتی ہوئی بس سے اترتے ہوئے مرنا نہیں چاہتے۔ آخر ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کو منہ دکھانا ہے۔ وہاں ہم سے سوال و جواب ہوں گے۔ اگر ہم سے پوچھا گیا کہ آپ کیسے آئے؟ تو ہم جواب دیں گے چلتی ہوئی بس سے۔ ہمیں بتایا جائے گا بس ہی کیا کوئی بھی چلتی ہوئی سواری یہاں نہیں آتی۔ تم یہاں تک بس سے آئے کیسے واپس جاؤ۔'' ہم جواب دیں گے ''بس سے آئے نہیں بلکہ چلتی ہوئی بس سے اترتے

نہیں چاہتا۔ ویسے اللہ تعالیٰ جب چاہے اُٹھالے مگر مجھے چھ مہینے کی مہلت تو چاہیے ہی چاہیے۔''

اس دوران دو ایک مسافر بس سے اُتر گئے مگر کچھ اُترنے کے بجائے خالی نشستوں پر پھر سے بیٹھ گئے۔ ایک نے سوال کیا'' آپ خود ہی کہہ رہے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر ہے پھر آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہیں کہ چھ مہینے کی مہلت چاہیے ہی چاہیے۔''

میں نے کہا۔'' دیکھئے، آپ لوگ اپنا راستہ کھوٹا مت کیجیے۔ بات بلاوجہ لمبی ہوجائے گی۔''

''ہمیں آپ بتایئے، ہماری فکر نہ کیجیے۔ ہمیں بھی ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔''

''مگر مجھے تو اسی اسٹاپ پر اترنا تھا وہ گزر بھی گیا۔ میرے پاس تو اب واپسی کے کرائے کے پیسے بھی نہیں ہیں۔''

''نہیں آپ بتایئے۔ واپسی کی فکر نہ کیجیے۔ ہم آپ کو واپس یہیں تک پہنچادیں گے۔''

''اصل میں وہ کام ہی اس نوعیت کے ہیں کہ انھیں مکمل کیے بغیر میں مرنا نہیں چاہتا اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ مجھے وہ مہلت مل جائے گی۔'' میں نے دیکھا کہ کچھ دوسرے مسافر جو اگلے اسٹاپ پر اُترنا چاہتے تھے وہ بھی ٹھٹھک کر رُک گئے۔ میں نے کہا کہ ''آپ لوگ ان دوسرے مسافروں کا وقت بھی برباد کریں گے۔ یہ لوگ ضروری کاموں سے کہیں جارہے ہیں۔ ان سب کو تو اس گفتگو سے دلچسپی نہیں ہوگی۔'' ان لوگوں میں سے بھی بیشتر افراد نے بات سننے میں دلچسپی ظاہر کی اور اصرار کیا کہ میں ان ضروری کاموں کی تفصیل بتاؤں۔ میں نے کہا'' میں بلاوجہ یہ ذکر چھیڑ کر آپ سب سے شرمندہ ہورہا ہوں۔ صرف میری وجہ سے آپ میں سے کتنوں کا وقت ضائع ہورہا ہے۔ مجھے تو بینک سے کام تھا واپس آتے آتے بینک بند ہوجائے گا۔ کل پھر آؤں گا اسی بس میں جہاں سے یہ چلتی ہے۔ سب کچھ تفصیل سے بتادوں گا۔ آپ لوگ اپنا اپنا کام کرلیں۔''

''نہیں نہیں۔ ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے ہم لوگ اسی بس سے واپس آجائیں گے۔ آپ اپنی بات جاری رکھئے۔'' اس درمیان کنڈکٹر بھی بات چیت میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔'' سب لوگوں کا بقیہ کرایا معاف۔ انکل

شہروں میں ہیں۔ کسی ایک ملک یا ایک شہر میں نہیں ہیں۔ دوسرے اسطرح کام میرے اطمینان کے مطابق نہیں ہوگا۔ میں اتنی محنت اور خرچہ تو اپنے اطمینان کے لئے کر رہا ہوں۔''

''پھر آپ کس طرح کریں گے۔''

''میں نے بتایا نا کہ میں نے تقریباً سب انتظام کرلیا ہے۔ میرے پاس ایسے بیس افراد ہیں جس میں ہر ایک ان بیس افراد میں سے ایک کو پہنچانتا ہے۔ میں نے ایسے ہر فرد کے ساتھ دو دو مزید افراد کی بیس ٹیمیں بنادی ہیں اور ہر ٹیم کے حوالے اُس کی شناخت والے فرد کی تمام تفصیلات کردی ہیں۔ اُن سب لوگوں کے پاسپورٹ اور ویزا کا انتظام کرا رہا ہوں۔ جیسے ہی یہ کام مکمل ہوگا اُن کے ہوائی جہاز کے ٹکٹ خریدنا ہوں گے۔ اس کے لئے مجھے کافی رقم کی ضرورت ہے۔ یہاں بینک میں اسی مقصد سے جارہا تھا۔ آپ لوگوں نے بات چھیڑ دی۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آج کی تاریخ اچھی ہے بینک سے قرضہ مل جاتا۔ اب دو دن بینک بند رہے گا۔ یہاں تو ایک ایک پل گزارنا مشکل ہورہا ہے۔ اللہ جانے اب قرضہ ملے گا بھی یا نہیں۔ خود بھی ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ وہ لوگ بھی میری طرف سے غافل نہیں ہیں۔ میرے بارے میں ایک ایک پل کی خبر رکھتے ہیں۔'' میں نے رُک کر ایک ایک کے چہرے کو باری باری غور سے دیکھا۔'' اب یہ فکر لاحق ہوگئی ہے کہ بحفاظت گھر تک کیسے جاؤں گا۔''

''آیئے یہیں اُتر لیتے ہیں میں آپ کو ٹیکسی سے چھوڑ دوں گا'' ایک صاحب نے پیشکش کی۔ میں نے اُن کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا۔ اس میں بہت سی تصویریں تھیں۔ ان میں کی ہر تصویر کو غور سے دیکھ کر ان صاحب کا چہرہ ملانے کی کوشش کی اور پھر اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں میں یہاں سے پیدل چلا جاؤں گا آپ زحمت نہ کریں۔ مجھے ابھی چھ مہینے کسی نہ کسی طرح اپنی حفاظت کرنی ہے۔ کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لے سکتا اور ساتھ ہی اس مدت میں اپنا کام مکمل کرنے پر توجہ بھی دینی ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ خدا حافظ۔'' پھر رُک کر کہا'' آپ برا نہ مانئے گا میں آپ پر شک نہیں کر رہا۔ احتیاط بہر حال لازم ہے۔'' میں بتا نہیں سکتا کہ

''اوڑھنی اور چہار دیواری

کہتے ہیں کہ انسان کو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ یہاں ہمیں چادر کبھی دیکھنے تک کو نہیں ملتی پاؤں کہاں سے پھیلاتے۔ اماں کی چادر ضرور دیکھی تھی بلکہ ہر روز ہی دیکھتے تھے۔ امروہہ کی دیگر پردہ دار خواتین کی طرح اماں بھی اسے اوڑھنی کہتی تھی۔ وہ اسے سر کھلا رکھنے کے لئے استعمال کرتی تھی۔ سر ڈھکنے کے لیے وہ ہمیشہ پتیلیوں کے ڈھکنے استعمال کرتی تھیں جس سے سر ڈھک بھی جاتا تھا اور گرمائی بھی آجاتی تھی۔ خصوصاً چائے کی پتیلی کے ڈھکنے سے کیوں کہ:

ایک دوشیزہ کے لبوں کی طرح
اس میں گرمی بھی ہے اور مٹھاس بھی ہے

عام امروہہ والیوں کے لئے تو یہ چادر اوڑھنے اور بچھانے دونوں ہی کام میں آتی تھی۔ مگر اماں کی یہ چادر کسی کام کی نہیں تھی یا شاید وہ خود ہی اسے کسی کام میں نہیں لاتی تھیں کیوں کہ یہ ایک بہت ہی بیش قیمت اور انوکھی چادر تھی۔ جو جاپانی پہلون انوکی کے ذریعہ ان تک پہنچی تھی۔ یہ فرانس کے کسی بہت بڑے ڈیزائنر نے تیار کی تھی اور ملکہ وکٹوریہ کے جشن تاجپوشی کے موقع پر بطور تحفہ انھیں پیش گئی تھی بعد میں ملکہ وکٹوریہ نے یہی بیش قیمت چادر اماں کو اُن کے سیدانی ہونے کی پہلی سالگرہ کے موقع پر شہنشاہ جاپان سے کہہ کر انوکی کے ذریعہ بھجوائی تھی۔ دراصل اماں امروہہ کی پہلی سیدانی تھیں جن کے سیدانی ہونے کی شہادت تمام اہلِ اور نااہلِ امروہہ نے دی تھی۔ کیوں کہ وہ ان سب کے سامنے سیدانی ہوئی تھیں یعنی بالکل الف سیدانی۔ ہمیں انھیں کی اولاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اکثر مرزا غالب کا یہ مصرعہ گنگناتے رہتے تھے:

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے

بہت دنوں تک ہم اس ترکیب پر گھر بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ بہت سے نقشے بنوائے۔ ڈھیر ساری لکڑی کی چھوٹی چھوٹی اینٹیں بنوا کر لائے اور گھنٹوں میز پر مرزا کا تصوراتی گھر تعمیر کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر ناکام رہے۔ ایک تو اُن کے بیان کردہ نقشے میں چھت اور زمین کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ دیوار اور در کے بغیر تو کسی نہ کسی طرح گھر بنایا جا سکتا تھا مگر چھت اور زمین کے بغیر کیسے ممکن تھا۔ اگر ممکن ہوتا تو مرزا بے در و دیوار کے ساتھ ''بے زمین و چھت بھی کہہ سکتے تھے۔ انھوں نے تو ساری شاعری اپنی ہی زمینوں میں کی ہے اور اپنی ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے۔ چند روز تک غور کرنے کے بعد ہم نے مرزا کی مدد کے بغیر ہی اماں کے دل میں ایک چھوٹا سا گھر کر لیا جو جلد ہی اُن کے مقبرے میں تبدیل ہو گیا۔

ہم نے بڑی عزت اور احترام کے ساتھ اماں کو اس مقبرے میں دفن کا انتظام کیا۔ قبر میں اتارنے کے بعد اُن کی مشہور و معروف ''اوڑھنی'' کفن کے اوپر ڈال دی مگر لوگوں کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ چادر نے فوراً ہی سمٹ سمٹا کر اُن کے سر کو ڈھک دیا اور سارا کفن پوش جسم کھلا رہا۔ ہم نے بار بار یہ عمل دہرایا اور ہر بار چادر سرک اور سمٹ کر اُن کر سر کو ڈھک دیتی تھی۔ سب لوگ اس بات پر حیران تھے کہ جس چادر نے زندگی بھر ان کا سر کھلا رکھا تھا وہ آخر اُن کے مرنے کے بعد سر ڈھکنے پر کیوں بضد ہے۔

اتنے میں ایک بقراط نے ہماری پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''کوئی بھی چادر بغیر چادر دیواری کے چادر تو ہو سکتی ہے۔ مگر اوڑھنی نہیں۔ چار دیواری ملنے کے بعد تمہاری اماں کی یہ چادر اوڑھنی ہو گئی ہے۔ مبارک ہو۔''

■○■

حقوق (محفوظ وغیر محفوظ دونوں سمیت) شامل ہیں مثلاً حقوقِ ملکیت، حقوقِ شہریت، حقوقِ شوہریت، حقوقِ زوجیت، حقوقُ العباد، حقوقُ الافراد، حقوقِ نسواں، حقوقِ نسیاں اور حقوقِ انسدادِ بیرحمئ جانوراں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ وہ چند بنیادی انسانی حقوق ہیں جو سب انسانوں کو حاصل نہیں ہوتے بلکہ اُن کی فہرست وقتاً فوقتاً حکومتوں کی طرف سے جاری کی جاتی ہے۔ بے بنیادی حقوق کا فیصلہ لاٹری کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ انسان کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ غلطی کا پتلا ہے یعنی غلطی کرنا انسان کی فطرت ہے To ERR is Human دوسرے الفاظ میں Not to ERR is in-human جو غلطی نہیں کرتا وہ انسان نہیں ہے۔ گویا ہر انسان کسی نہ کسی انسان کی غلطی ہی سے پیدا ہوتا ہے اس طرح غلطی کرنا بھی انسان کا بنیادی حق ہے۔

گزشتہ دنوں جس انسان نے ہمیں موٹر سائیکل سے ٹکر ماری وہ اس کی وہی غلطی تھی جو اس کا بنیادی حق تھی۔ موٹر سائیکل سوار اگر قانونی طریقہ سے وہ راستہ اختیار کر کے اور یوٹرن Uturn کر کے دوسری سڑک پر آتا جس پر وہ آنا چاہتا تھا تو اس میں اسے ایک منٹ زیادہ لگتا بمقابلہ اس چھوٹے راستے کے جو اس نے ایک منٹ بچانے کے لئے غیر قانونی طریقہ سے اختیار کیا اور یہ تک نہیں دیکھا تھا کہ اس میں ایک ایسے شخص کی جان بھی جاسکتی تھی جو قانونی طور پر سڑک پار کر کے دوسری طرف آرہا تھا۔ مگر اس نے یہ دیکھا کہ چند روزہ زندگانی کے لیے ایک ایک پل بھی بہت قیمتی ہے، ایک منٹ تو بہت بڑی بات ہے۔ چنانچہ اس نے وہ ایک منٹ بچانے کے لیے بہت تیزی سے Short Cut اختیار کیا اور ہمیں ٹکر مارتے ہوئے موٹر سائیکل کی رفتار مزید تیز کردی اور فرار ہوگیا۔ اسے یہ تو اندازہ ہوگا کہ جس رفتار سے اس نے ہمیں ٹکر ماری تھی اس سے ہم ہی کیا ہماری جگہ کوئی ہاتھی گھوڑا بھی ہوتا تو وہ بھی گر جاتا۔ کیوں کہ یہ اس کا تو پہلا تجربہ نہیں رہا ہوگا اور نہ ہاتھی گھوڑے کا۔ اس نے تو یہ بھی نہیں سوچا کہ اس کی حرکت سے نہ صرف اس کی اپنی زندگی بلکہ اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر جو دوسری سواری بیٹھی تھی اس کی زندگی بھی ختم ہوسکتی تھی۔ کیوں کہ اس کے

ہمیں اس بات کا بھی کوئی افسوس نہیں ہے کہ اس قدر شدید چوٹ لگنے کے باوجود ہم زندہ کیوں بچ گئے چلو آج بچ گئے۔ کل نہیں بچیں گے۔ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی۔ ہم بھی یہیں ہیں اور موٹر سائیکل سوار بھی۔ یہ نہیں تو اور بہت سے۔

سفر ہے شرط، ''مسافر نواز'' بہتیرے

مرنا تو ایک نہ ایک دن سبھی کو ہے۔ بکرا ہو یا انسان۔ بلکہ ہمیں تو اس بات کی خوشی ہے کہ کسی حادثہ میں چوٹ لگنے کا ہمارا یہ پہلا تجربہ ہوا۔ اگر خدانخواستہ ہم اس حادثہ میں مر گئے ہوتے تو ہمیں مرنے کا تجربہ تو یقیناً ہو جاتا مگر چوٹ لگنے کے تجربہ سے زندگی بھر کے لیے محروم ہو جاتے۔ اس حادثہ کا ہمارے نقطۂ نظر سے بھی مثبت پہلو یہی ہے کہ مرنے کا پہلا تجربہ ہونے کا Chance ابھی باقی ہے۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری زندگی کا بیشتر حصہ Chances پر ہی گزرا ہے اور وہ بھی مختلف قومی اور بین الاقوامی ایئر پورٹس پر۔ PIA کی ملازمت سے برطرفیوں کے علاوہ اور کچھ حاصل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر Chance کے تجربے بہت ہوئے۔ اگر ہر بار سیٹ مل جایا کرتی تو ہم اتنے بہت سے Chances کے تجربات سے کس طرح فیضیاب ہوتے۔ اب کم از کم اتنا تو ہے کہ دور دور سے لوگ ہمیں دیکھنے آتے ہیں۔ ایک ایسے شخص کو جس کی زندگی کا بیشتر اور ملازمت کا سارا کا سارا حصہ صرف Chance پر ہی گزرا ہے۔ ہم اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا تہہ دل سے شکر ادا کرتے ہیں کیوں کہ اس طرح مرنے کا تجربہ حاصل ہونے کا امکان روشن ہے۔ بقول شاعر:

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں

ہمیں دراصل افسوس اس بات کا ہے کہ وہ ظالم موٹر سائیکل سوار فرار ہوتے ہوتے ہمیں اس چوٹ پر لگانے کی کوئی دوا بھی بتا کر نہیں گیا۔ چلو ہمارا پہلا تجربہ تھا مگر اس کا تو پہلا تجربہ نہیں تھا۔ وہ تو اس قسم کے بہت سے تجربات و حوادث سے گزرا ہوگا۔ کتنوں کی جانیں لی ہوں گی۔ کتنوں کو زخمی کیا ہوگا۔ خود بھی ایک آدھ بار اگر مرا نہیں ہوگا تو زخمی تو ضرور ہی ہوا ہوگا۔ ہم نے تو کوئی ایک بھی ایسا موٹر سائیکل سوار نہیں دیکھا جو کبھی زخمی تک نہ ہوا ہو۔

تب تو کوئی بات نہیں تھی۔ مگر لغزش خلافِ معمول کچھ زیادہ تھی۔ چنانچہ لغزش کو دیکھتے ہوئے اس سوچ میں پڑ گئے کہ بیگم کو اس حادثہ کی اطلاع دیں یا نہ دیں۔ ایک تو ہماری بات کچھ قدرتی طور پر بھی زیادہ طویل ہوتی ہے۔ یعنی اگر کوئی غلطی سے ہم سے آلو ساگ کی بھوجی بنانے کی ترکیب پوچھ لے تو ہم آلو کی کاشت کے لیے کتنے ایکڑ زمین میں کتنے من امریکی کھاد ڈالنے سے شروع کرتے ہیں۔ پھر بیگم ہم سے بھی زیادہ ہولو، نہیں ہولو نہیں بلکہ دانشور، پوری بات سنے بغیر، صرف حادثہ کا نام سنتے ہی چپکے سے سٹک کے کمرے میں جائیں گی اور فوراً ہی اسی طرح چپکے سے سامنے آکر بیٹھ جائیں گی۔ باقی کا کام وہ کمپنی کرے گی جس کی ٹیلی فون لائن ہمارے گھر میں ہے۔ اس کے بعد یہ اطلاع پانچ منٹ کے اندر اندر ہمارے اور ان کے دونوں میکوں اور دونوں سسرالوں سمیت دونوں کے مشترکہ حلقہ احباب تک پہنچ جائے گی کہ خدانخواستہ ہمارا دیہانت ہو چکا ہے۔ انھیں تو صرف چند سکینڈ کی ایک کال کرنی ہوتی ہے۔ جس کو یہ کال ہوتی ہے اس کے پاس پہلے سے پانچ نام اور نمبر ہوتے ہیں۔ اور وہ صرف حادثہ کا لفظ سنتی ہے۔ کیونکہ وہ بہت عقل مند ہے اور عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ وہ جن پانچ کو ٹیلی فون کرتی ہے ان میں سے ہر ایک کے پاس پانچ نام اور نمبر ہوتے ہیں۔ پھر ان سب کے پاس پانچ پانچ نام اور نمبر ہوتے ہیں۔ اب ذرا حساب لگائیے یہ سب کتنے ہو گئے یعنی ایک کے پانچ پھر پانچ پنجے پچیس، پچیس پنجے ایک سو پچیس، ایک سو پچیس پنجے چھ سو پچیس، چھ سو پچیس پنجے۔ بس خدا کے لیے بس کرو، چھ سو پچیس تک رہنے دو ہماری طبیعت تو اسی سے پچیس ہو جاتی ہے۔ گردن مروڑنے کے لیے ایک پنجہ بھی بہت ہے۔ بشرطیکہ گردن ہم جیسے شریف آدمی کی ہو۔ ان میں سے بھی چلو کچھ گھر پر نہیں ملے۔ پھر بھی کم سے کم 500 کے قریب تو لوگ شام تک گھر پر جمع ہو جائیں گے۔ اب ان سب کے لیے شامیانوں، قناتوں اور کرسیوں کا اور رات کے کھانے کا انتظام کراؤ۔ اگر اتنی حیثیت ہوتی تو ولیمہ نہ کرا لیا ہوتا۔ لوگوں کے اتنے طعنے تو نہ سننے پڑتے جو آج تک سن رہے ہیں۔ وہ تو ویسے بھی سستے کا زمانہ تھا۔

لگوانے سے زیادہ زخم لگوانے میں آرام ملتا تھا۔ بڑی میٹھی میٹھی کسک ہوتی تھی۔ اگر کبھی چونا زیادہ بھی لگ جاتا تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ چونے کی زیادتی کچھ زیادہ ہی تڑپ پیدا کرتی تھی۔ یعنی:

تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا آرام کرتا ہے
کہ لب پر ہر تڑپ کے ساتھ ان کا نام ہے

اس زمانے میں یہ ''اُن'' بھی بڑی آفت شے ہوتی تھی۔ اللہ ہر ایک کو اس کی اپنی اپنی ''اُن'' سے بچائے۔

مگر اب بڑھاپے میں ہم نے انھیں سختی سے تاکید کر دی ہے کہ دل پر لگے ہوئے زخم پر یہ لیپ لگانے کی کوشش نہ کرنا۔ کیونکہ ایک تو حرام خور پہلے ہی کافی کام چور ہو گیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر گھبرانے لگتا ہے۔ ایک دھڑکنے کا کام رہ گیا ہے۔ اس میں بھی ہزار نخرے ہیں۔

''یوں نہیں دھڑکوں گا۔ یوں دھڑکوں گا''

''ابے یہ نخرے کسی اور کو دکھائیو۔ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ سیدھی طرح دھڑکتا ہے دھڑک۔ نہیں دھڑکتا مت دھڑک، دھڑکنے والے اور بہت سے ہیں۔ تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔ ہم کسی اور سے دھڑکوا لیں گے۔ جس کی ہتھیلی پہ دو پیسے زیادہ رکھیں گے بے دھڑک دھڑکنے کو تیار ہو جائے گا۔ پیسہ بھلا کسے برا لگتا ہے۔

ویسے بیگم خود بھی اب زیادہ احتیاط کرتی ہیں۔ دل کے زخم پر اگر لیپ لگانا بھی ہوتا ہے تو خالی ہلدی کا لیپ لگاتی ہیں۔ اس ڈر سے کہ اگر خدانخواستہ ذرا بھی چونا زیادہ لگ گیا اور اس نے دھڑکنا چھوڑ دیا تو وہ ٹوٹروں ٹوں بیٹھی:

منہ دیکھتی رہ جائیں گی لے جائے گا اک دن
اس بے وفا سے کچھ بعید نہیں ہے۔

■○■

سارا ملک صرف ایک کام میں لگا ہوا تھا کہ ''لے کے رہیں گے پاکستان بٹ کے رہے گا ہندوستان۔'' مگر ہم اس بات پر اکڑے ہوئے تھے کہ:

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آ جائے

مگر یہ سوچ سوچ کر دل بھی دھڑکتا رہتا تھا کہ اگر سچ مچ مقابل آ گئی تو؟ ''تو کا ہمارے پاس ایک ہی جواب تھا:

''اگر ایک ایک کر کے آئے تو ہر چیز سے نپٹ لیں گے۔ ورنہ بصورت دیگر ہر چیز ہم سے لپٹ لے گی۔''

اس وقت ہر کام جذبۂ جہاد سے کرتے تھے۔ حالانکہ جذبۂ عشق سے سرشار رہتے تھے۔ اور اسی وجہ سے عشق بھی جہاد ہی کی طرح کرتے تھے کیونکہ ایک سے ایک کافر سے بلکہ کافر ادا سے مقابلہ رہتا تھا۔ کیا مار دھاڑ کا عالم ہوتا تھا۔ بالکل ناڈیا اور جان کاڈس کی فلموں کا سا منظر رہتا تھا۔ دروازے تک کیا گلی کے نکڑ تک پہنچنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ محلّے کی حدود میں قدم رکھا اور جہاد شروع جبکہ عشق شروع ہونے میں ابھی دیر تھی۔ اس کے لیے گھر کے اندر پہنچنا ضروری تھا۔ دراصل عشق ہی وہ نیک جذبہ ہے جس کے لیے جہاد گھر کے اندر ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ:

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود اور ہر معشوق پیدا گھر کے اندر می شود

گھر کے اندر صرف شادی کے دن ہی پہنچ پائے تھے۔ جہاد کا وہ پہلا اور آخری دن تھا جس میں غازی بھی ہوئے اور شہید بھی، کیونکہ جس طرح:

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اسی طرح عشق سچا گھر میں ہے اور گھر کے باہر کچھ نہیں۔

دراصل عشق ہی وہ واحد جذبہ ہے جسے شروع کرنے کے لیے بھی جہاد کرنا پڑتا ہے اور ختم کرنے کے لیے بھی۔ درمیانی مدت یعنی MID TERM کا گزارنا ہر فریق کی اپنی اپنی صواب دید پر ہے خواہ گھر کے:

اندر گزار یا اسے باہر گزار دے

مختارنامہ، Power of Attorny کوئی سرکاری ترجمان یا نمائندہ مقرر کیا گیا ہے جس کے تحت وہ کسی حکومت یا ادارے کی طرف سے پالیسی بیان جاری کیا کرے۔ جیسے وہائٹ ہاؤس میں پریس سکریٹری روزانہ اخباری نمائندوں کو پریس بریفنگ دیتا ہے اور حکومت کے فیصلوں سے آگاہ کرتا ہے''افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادو۔ عراق کو تہس نہس کردو۔'' بعد میں صدر ''غریب'' کو گالیاں پڑتی رہتی ہیں حالانکہ اس بے چارے کو پتہ بھی نہیں تھا۔ اگر یہ پیشین گوئی ہے تو اس پر کسی نجومی، عامل یا پیشین گوئی کرنے والے کا نام ہونا چاہیے تھا جیسے Nostra Damus نام کے کسی شخص نے سیکڑوں سال پہلے بہت سی پیشین گوئیاں کی تھیں جو کتابی شکل میں موجود ہیں۔ اس کی اس وقت کی پیشین گوئیاں وقتاً فوقتاً درست ثابت ہوتی جارہی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ 9/11 کے بارے میں بھی اس نے اسی زمانے میں پیشین گوئی کردی تھی جبکہ اس وقت ورلڈ ٹریڈ سینٹر کسی کے ذہن تک میں بھی موجود نہیں تھا۔ جین ڈکسن Jean Diskson تو ابھی زندہ ہے۔ وہ ہر سال کے شروع ہونے سے پہلے سارے سال کے لیے پیشین گوئیاں کرتی ہے جو کتابی شکل میں شائع بھی ہوتی ہیں اور ترتیب وار سچ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ سی آئی اے سارے سال کے لیے جو منصوبے بناتا ہے وہ جین ڈکسن کو بتادیتا ہے اور جین ڈکسن انھیں اپنی پیشین گوئیوں میں شامل کرکے شائع کرادیتی ہے۔ سی آئی اے ان پیشین گوئیوں پر مشتمل اپنے منصوبوں پر عملدرامد کرتا رہتا ہے۔ دس پندرہ سال کے بعد سی آئی اے خود اپنی رپورٹوں میں اپنے منصوبوں کی کامیابیوں کا اعتراف کرتا ہے جیسے 1965 میں انڈونیشیا میں قتل عام، 1973 میں چلی میں منتخب حکومت کا تختہ الٹ کر لاکھوں لوگوں کا قتل، شہنشاہ ایران کو جلاوطنی سے واپس لاکر دوبارہ تخت نشین کرانا۔ پاکستان میں بھٹو حکومت کو ختم کرکے ضیاء الحق کو لانا، افغانستان میں روسی فوجوں کے خلاف مجاہدین کو تیار کرانا۔ کبھی کبھی تو جین ڈکسن شرارتاً ایک آدھ فرضی واقعہ اپنی پیشین گوئی میں لکھ دیتی ہے اور سی آئی اے آنکھ بند کرکے جین ڈکسن کی 'لاج' رکھنے کے لیے اس پر عمل کردیتا ہے۔ اگست 1988 میں پاکستان میں

تو کون سی بدلی میں مرے چاند ہے آجا

حالانکہ چاند بدلی و دلی میں نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ تو ان کی مٹھی میں ہوتا ہے جو صرف پیسے سے نکلتا ہے۔ نور جہاں کو تو خالی عید منانے کے لیے ایک چھوٹی سی جھلک چاہیے:

چھوٹی سی جھلک دے کے مری عید منا جا

نور جہاں کو چاہیے کہ عیدی ان ملاؤں کی مٹھی میں رکھے اور اپنے چاند کی جھلک دیکھ لے اور اگر عیدی کے پیسے بھی نہیں ہیں تو حرافہ تجھے عشق کرنے کی کیا لوٹ لگی تھی، باؤلے کتے نے کاٹا تھا؟ تجھے پتہ نہیں: یہ عشق نہیں آساں

یہ تو بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں
تو کجا بہترِ تماشہ می روی

■○■

مایۂ ناز تصنیف ''سرمایہ'' (Das Capital) لکھنے کے بعد، جس کے لیے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

مگر رتن سنگھ اس روز ''در بغل دارد رسالہ'' تھے۔ یعنی ماہنامہ ''راہی'' جالندھر جس میں ان کی پہلی افسانوی تخلیق شائع ہوئی تھی اور جس کے تخلیقی کرب میں ہم انھیں اکثر مبتلا دیکھ چکے تھے۔ اس وقت ان کے چہرے پر (بشرطیکہ چہرے کا تصور داڑھی مونچھوں کے بغیر اور بکھرے ہوئے گیسو کے ساتھ کیا جائے) وہ حیا آمیز فاخرانہ مسکراہٹ تھی جو کسی ''نو بیاہی'' زچہ کے چہرے پر اس وقت ہوتی ہے جب کوئی اس سے یہ پوچھے:

''لڑکا ہے یا لڑکی...''

اور وہ ''فاتح عالم'' زچہ جواب دینے کے بجائے شرماتے ہوئے دھیرے سے نومولود کے کمبل کا کونا اس کے کولہے سے ذرا نیچے سرکا کر اپنی فاخرانہ مسکراہٹ کی اصل وجہ بھی مع ثبوت پیش کر دے۔

یہ افسانہ پہلے ہی ہم ان کی زبانی سن چکے تھے مگر سنی سنائی باتوں کی طرح اس پر بھی یقین نہیں آیا تھا۔ اب رسالے کے صفحات پر دیکھ کر اس کے ایک ایک حرف پر یقین آ گیا تھا۔ اسی دوران ہم بھی چند افسانے لکھ چکے تھے مگر ہمارا ''شعبۂ نشر و اشاعت'' بالخصوص 'اشاعت' خاصہ کمزور تھا۔ ہاں نشر والا شعبہ اس قدر کمزور نہیں تھا کیونکہ ہم آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے ایک افسانہ نشر بلکہ اس کا ''حشر'' نشر کر چکے تھے۔ اشاعت کی نوبت کافی عرصہ بعد آئی تھی اور پھر آئی جوان کی یاد کی طرح آتی چلی گئی۔ ہماری اس بات کو آپ اس لطیفہ کے تناظر میں پڑھیں جس میں ایک مینڈک اور ہاتھی کی دوستی ہو گئی تھی۔ ایک روز مینڈک نے ہاتھی سے اس کی عمر پوچھ لی تھی جو اس نے چھ ماہ بتائی تھی۔ مینڈک نے ذرا جھینپ کر معصومیت سے جواب دیا تھا۔

''عمر تو میری بھی چھ مہینے ہی ہے۔ مگر صحت ذرا خراب رہتی ہے۔''

خوبی ہی نظر نہیں آئی۔ ''مگر یہ حضرت ہم سے ہر بات چھپاتے تھے۔'' کوئی ضروری ہے خوبی سے ہی دوستی کریں۔ تم نے بھی تو خرابیاں ہی دیکھ کے دوستی کی ہے۔'' کج بحثی تو کوئی اس سے سیکھے ہم نے کہا ''جھوٹ بولو گے تو تمہاری ہی زبان جلے گی۔'' ہم دونوں میں دور دور تک کوئی قدر مشترک نہیں تھی سوائے ''ناقدری'' کے۔ یعنی ایک ظالم نے سماج کو ٹھکرا دیا تھا اور دوسرے کو ظالم سماج نے۔

مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی ہم نہیں کبھی ''وہ'' نہیں

اور ہم دونوں ہی زیادہ تر جن مقامات پر ہوتے تھے ان میں سے بیشتر شرم کے مقام ہوتے تھے جو صرف ڈوبنے کے کام آتے ہیں۔

جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی تھی۔

ہم دونوں میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جو دوستی کی بنیاد بن سکتی خواہ کھوکھلی ہی سہی۔ ہم جنس ہونے کے علاوہ ہم دونوں میں ہر چیز کا اختلاف تھا۔ نہ ہم عمر، نہ ہم جماعت، نہ ہم وطن، نہ ہم محلّہ، نہ ہم زبان، نہ ہم مشرب، نہ ہم پیشہ اور نہ ہم مذہب۔ ان تمام اختلافات کے ساتھ ہماری دوستی کی ایک معقول بنیاد بنتی تھی۔ وہ تھی اختلاف مذہب، اس اختلاف پر ہم دونوں متفق تھے اور جتنی دیر بھی ہم دو دیوانے مل بیٹھتے تھے اتنی دیر رتن سنگھ اتنے پکے شیعہ ہوتے تھے کہ مستقل واقعہ کربلا کے بارے میں کنّن صاحب کے جملے رٹے رٹائے انداز میں دہراتے رہتے تھے اور ہم بات چیت کا آغاز 'ست سری اکال' سے کر کے 'واہ گورو کی کرپا' پر ختم کرتے تھے اور اس درمیان برہنہ کرپان لہراتے رہتے تھے۔ 'ادئے ماں دے پتر سانوں جاندائیں اے' دونوں کی صورت بالکل یہ تھی کہ:

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا

رتن سنگھ پیدائشی طور پر برسر روزگار تھے کیونکہ ان کے یہاں شادی کے لیے روزگار کے علاوہ کسی چیز کو بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہم نے تو جب بھی اسے دیکھا ہمیشہ اس کی گودی بھری ہوئی ہی دیکھی اور ہر بار بچپن میں سنی ہوئی ایک دعا یاد آئی:

شرماتے ہوئے یہ تک بتادیا تھا کہ ''انھیں بیوی کو بھی خود ہی لیپا پوتی کر کے جوان رکھنا ہوتا ہے۔ زندگی بھر اسی ایک پر گزر بسر کرنی ہوتی ہے۔ بیوی تو اپنی کنگھی چوٹی تک خود نہیں کر پاتی۔ ایک تو چوٹی زیادہ تر ہمارے ہی ہاتھ میں رہتی ہے۔ دوسرے اس غریب کو ہمارے کیس، داڑھی سے ہی کب فرصت ملتی ہے۔ ہم لوگ تمہاری طرح نہیں کہ ایک کی جوانی پوری طرح چڑھتی نہیں کہ دل سے اترنے لگی اور دوسری تیسری اور چوتھی تک اکٹھی کر کے لے آئے جیسے کہیں کوئی سیل لگی ہو پھر خود ہی کسی کو دودھ پلا رہے ہیں اور کسی کے پیمپر بدلوا رہے ہیں۔ قسم ہے ہم تم سے جلتے نہیں ہیں بلکہ تم پر رشک کرتے ہیں۔ واہگورو کی کرپا سے ہر ایک کو ایسا ہی مذہب ملے جو اور چیزوں کے علاوہ آپس میں بیر رکھنا بھی نہیں سکھاتا۔ ویسے تمھیں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ سب کچھ تو پیدائشی طور پر ہی سیکھے ہوئے ہوتے ہو۔''

ہمارے قریب ترین دوستوں اقبال مجید، جمال پاشا اور حسن عابد کے ساتھ بلا مبالغہ اور بلا ناغہ کم از کم تین چار گھنٹے روزانہ گزرتے تھے۔ مگر رتن سنگھ کے ساتھ اتنا وقت مہینے بھر میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت تیزی سے ہمارے قریبی دوستوں کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ یہ بالکل اسی طرح ہوا تھا جیسے کسی دفتر میں کوئی غیر معمولی ذہین اور باصلاحیت کارکن آجائے اور بہت جلد اپنی کارکردگی اور ذہانت سے ترقی کے مختلف مدارج طے کرتا ہوا پرانے کارکنوں کو پیچھے چھوڑ جائے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ پیش ہے۔

ایک بقرعید کے موقع پر جمال کے والدین نے غالباً ان کے بردکھوے پر آنے والے کسی خاندان کو کھانے پر مدعو کر لیا تھا اور اس کے لیے پہلے سے کئی قسم کے کھانے تیار کر کے رکھ لیے تھے۔ کسی وجہ سے عین وقت پر مدعوئین نہیں آسکے اور وہ دعوت منسوخ کر دی گئی۔ گرمی کا زمانہ تھا اور اندیشہ تھا کہ اتنا ڈھیر کھانا ایک دو روز بعد خراب ہو جائے گا۔ لہٰذا اسے ضائع ہونے سے بچانے کی غرض سے جمال پاشا اور ان والدہ کی محبت نے

عزیز ہو گئے تھے جب میری چھوٹی بہن نے پہلی بار تمہاری شکل میں ایسا ''سِکھ'' دیکھا تھا جسے دیکھ کر اس نے ''سُکھ'' کی سانس لی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے تو اس نے فلموں میں ہی سکھ دیکھے تھے جو ہمیشہ ڈاکو کے روپ میں دکھائے جاتے تھے۔ اس کے بعد ہم کئی بار رتن سنگھ کے گھر گئے۔ ہفتہ کی شام کو رتن سنگھ دفتر سے چھٹی کے بعد ہمیں گھر لے جاتے تھے اور پیر کی صبح کو دفتر جانے سے پہلے گھر چھوڑ جاتے تھے۔ ہم دونوں کی یہ ملاقاتیں صرف ہمیں دونوں تک محدود رہتی تھیں جن میں وقفہ وقفہ سے ان کی بیگم کبھی چائے، کبھی لسی، کبھی کھانا اور کبھی آم یا خربوزے رکھنے آتی تھیں۔ اتوار کو تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے رام لعل صاحب بشیشر پردیپ، نسیم کنجاہی اور ستیش بترا یا انھیں کے ایک آدھ اور ملاقاتیوں کے یہاں ملنے چلے جاتے تھے۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم صاحب فراش ہو گئے۔ نہیں صاحب فراش نہیں یہ تو ہم نے بالکل ہی غلط لکھ دیا۔ فارغ التحصیل ہو گئے اور مرحلہ آیا تلاش ملازمت کا۔ دو چار جگہوں پر ہم نے درخواستیں دیں۔ کچھ بڑی بڑی دکانوں اور سنیما گھروں پر چوکیداروں اور گیٹ کیپروں کی جگہوں پر کوشش کی مگر کچھ نہیں ہوا۔ شامت اعمال ایک روز بے خیالی میں ہمارے منہ سے نکل گیا کہ اگر جلدی نوکری نہ ملی تو ابا جان ہمیں پاکستان بھیج دیں گے۔ بس یہ سننا تھا کہ ان کے اندر چھپے ہوئے سردار جی کو جوش آ گیا۔ دوسرے دن سے ان کا دفتر ان کا دفتر نہیں تھا بلکہ ہمارا دفترِ روزگار تھا اور رتن سنگھ ہمارے سکریٹری۔ مابدولت جب دوپہر کو بارہ بجے کے قریب ٹہلتے ہوئے اپنے دفتر آتے تھے تو، سکریٹری تمام ضروری درخواستیں لکھ کے ٹائپ کر کے سندوں کی کاپیاں لگا کے، لفافوں پر پتے لکھ کے حد یہ کہ ڈاک کے ٹکٹ تک لگا کے تیار کر چکا ہوتا تھا اور نواب صاحب، صرف دستخط کرنے کی زحمت کرتے تھے اور جب ''تھک کے چور'' ہو جاتے تھے تو میز پر ٹانگیں پھیلا کر اس خیال سے چائے کا آرڈر کرتے تھے کہ ''بے چارہ'' رتن سنگھ تھک گیا ہوگا۔ خدا کسی کے سر پہ دو دو ذمہ داریوں کا بوجھ ایک ساتھ نہ ڈالے۔ یعنی ''بے روزگاری اور حرام خوری'' کا اور اگر ڈالے تو اسے رتن سنگھ جیسا دوست بھی دے۔ یعنی ''اسے بازوئے حیدر'' بھی عطا کرے۔

پاکستان جانے کے تقریباً ایک سال بعد جب ہم لکھنؤ آئے تو رتن سنگھ کے علاوہ ہمارے سارے دوست (قمر رئیس، اقبال مجید، جمال پاشا، رضوان حسین، عثمان غنی) علی گڑھ جا چکے تھے جن سے دہلی سے لکھنؤ آتے اور جاتے ہوئے مل لیا تھا۔ حسن عابد میرے پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد کراچی آ گئے تھے۔ رتن سنگھ کو میرے آنے کی اطلاع تھی۔ ہم دونوں دوپہر کو کرشنا ریسٹورنٹ میں ملے تو رتن سنگھ نے کچھ رقم نکال کر میز پر رکھی اور کہا ''میں نے آج ہی یہ رقم ایڈوانس لی ہے اور یہ سب کی سب تمہارے اوپر خرچ ہوگی۔'' تھوڑی دیر کے لیے میرا آواز گنگ ہوگئی پھر میں نے ہمت کر کے میز پر مکا مار کر کہا ''دیکھتا ہوں کس مائی کے لال میں ہمت ہے جو میرے اوپر کچھ بھی خرچ کرے۔ جانتے ہو پاکستان سے آرہا ہوں پی آئی اے میں نوکر ہوں۔'' میں نے وہ روپے زبردستی ان کی جیب میں ٹھونس دیے۔ مگر رتن سنگھ کا وہ جملہ مجھ جیسے فقیر کو کروڑ پتی بنا گیا تھا۔

اس کے بعد جب میں ایک ماہ قیام کر کے پاکستان واپس آرہا تھا تو رتن سنگھ اس زمانے میں دہلی میں کسی امتحان کے لیے آئے ہوئے تھے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق اس روز ہم دونوں ساتھ تھے۔ اس وقت تک میں ہندوستانی شہری تھا۔ ویزا لینے کے لیے جب میں پاکستانی سفارت خانے گیا تو رتن سنگھ میرے ساتھ تھے۔ وہاں کسی ذمہ دار افسر نے بتایا کہ میں انکم ٹیکس کلیئرنس سرٹیفکیٹ کے بغیر سفر نہیں کر سکتا جو کہ لکھنؤ سے مل سکتا ہے کیونکہ میرا رہائشی پتہ لکھنؤ کا ہے۔ میری چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اسی روز شام کو میری پرواز جانے والی تھی۔ اور میرے پاس لکھنؤ جانے کا بالکل وقت نہیں تھا۔ رتن سنگھ دہلی میں اپنے چند عزیزوں کے پاس لے گئے تا کہ کسی بھی طرح وہ سرٹیفکیٹ دہلی سے ہی بن جائے۔ مگر دن بھر مارے مارے پھرنے کے بعد معلوم ہوا کہ لکھنؤ جائے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ PIA کے دفتر میں یہ بتانے کے لیے گئے کہ ہماری چھٹی بڑھا دی جائے۔ وہاں جب ایک سوال کے جواب میں ہم نے بتایا کہ ہمیں آئے ہوئے ابھی ایک ماہ ہی ہوا ہے تو ہمیں معلوم ہوا کہ اس سرٹیفکیٹ کی ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جنھوں نے تین مہینے سے زیادہ قیام کیا ہو۔ رتن سنگھ

دے دینا۔'' اور ہاں خیال رکھنا ہمیں تیرنا نہیں آتا۔ دوسرے یہ کہ اتنی گہرائی میں ڈوبنے کا تجربہ بھی نہیں ہے۔ طوفان کا اندازہ بھی کنارے سے نہیں چھت پر چڑھ کے کرتے ہیں۔

رتن سنگھ کا ایک بیٹا لندن میں ہے۔ اس سے ملنے کے لیے انھیں لندن تک آنا تھا اور ہم نے انھیں قسم دلا دی تھی کہ اگر وہاں سے ہمارے پاس امریکہ نہیں آئے تو ''یہ سب کھانا ہم یہیں چھوڑ جائیں گے۔ جیسا بھی سڑا بسا ہے تمھیں دونوں کو کھانا پڑے گا۔''

ہماری بیگم اور بچوں نے اس سے پہلے کسی سکھ کو اس قدر قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ پہلی بار ڈرتے ڈرتے دیکھا اور انھوں نے بھی وہی سانس لی جو بچپن میں ہماری چھوٹی بہن نے انھیں پہلی بار دیکھ کر لی تھی۔ دونوں میاں بیوی ۱۰ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ہمارے یہاں پہنچے یعنی ۹/۱۱ کی چاند رات کو۔

رات کو بیٹھے ہوئے بہت دیر تک ہفتے بھر کا گھومنے کا پروگرام ترتیب و تشکیل دیا گیا جس میں نیویارک و نیوجرسی کے مختلف تاریخی و تفریحی مقامات دیکھنا شامل تھا۔ ہمیں کچھ زیادہ ہی جوش تھا۔ برسوں پرانا قرض بھی تو چکانا تھا۔ دال میں نمک کے برابر ہی سہی۔

دوسری صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر نکلنے کی تیاری کر رہے تھے کہ سامنے دیواری سائز کے ٹی وی اسکرین پر عجیب و غریب مناظر نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ ایک جہاز آیا اور ایک انتہائی بلند عمارت سے ٹکرا کر جانے کہاں غائب ہو گیا۔ عمارت ٹوٹ پھوٹ کر بکھرنے لگی۔ پھر ایک اور جہاز آیا اور اسی عمارت کے دوسرے بلند ترین حصہ سے ٹکرایا اور پار نکل کر کہیں قریب ہی جا گرا۔ ہر طرف دھواں، آگ، دھول مٹی، یہ عمارت اور اس کے ٹاور عالمی سامراجی معاشی نظام کی علامت ورلڈ ٹریڈ سنٹر تھی۔ اس کے بعد ایک اور جہاز کی خبر ملی کہ واشنگٹن میں پنٹاگن کی عمارت کو پاش پاش کر گیا۔ یہ عالمی سامراجی قوت و جبروت کی علامت تھی۔ اسی روز ۱۱ ستمبر تھی۔ دوپہر تک ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دونوں ٹاور جو Twin Towers کے نام سے مشہور تھے، تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اس طرح بیٹھ گئے جیسے کسی اسپرنگ دار کھلونے کو اوپر سے ہتھیلی رکھ کر دبا دیا جائے۔ اس کا اسپرنگ ٹوٹ جائے اور کھلونا

اقبال مجید

گذشتہ سال جب میں کراچی آیا ہوا تھا تو حسن عابد نے اطلاع دی کہ وہ 'ارتقا' میں اقبال مجید پر ایک گوشہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں اقبال مجید پر کچھ لکھوں کیونکہ میری اقبال مجید سے بہت دوستی ہے۔ میں بیس بائیس سال سے امریکہ میں مقیم ہوں۔ مجھے کیا معلوم گوشہ کیا ہوتا اور کیسے نکالا جاتا ہے۔ وہاں تو ہر چیز کے نکالنے کے لیے آپریشن ہوتا ہے۔ میرے ایک حیدرآبادی دوست ہیں، ان کے یہاں کبھی جانا ہوتا تھا تو وہ اپنی بیگم کو آواز لگا کر کہتے تھے ''بیگم صاحباں! ذرا سنتے کیا۔ یہ اپنے اختر بھائی تشریفاں لائے ہیں۔ تھوڑا گوشہ ہونے کا۔'' میں نے کئی بار یہ جاننے کی کوشش کی کہ گوشہ کیسے ہونے کا اور کیوں ہونے کا۔ مگر کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ اکثر یہ لفظ اس مفہوم میں بھی سننے میں آیا کہ ''فلاں کے دل میں ڈھاکے کے لیے، نرم گوشہ، ہے۔'' اس کا مطلب کسی سے معلوم کرنے کی ہمت اس لیے نہیں پڑی کہ میری جہالت اور کم علمی کا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور میرے پاس یہ اکیلا ہی بھانڈہ رہ گیا ہے جسے میں اب تک پھوٹنے سے بچاتا رہا ہوں۔ خیال آیا کہ اعتماد میں لے کر حسن عابد سے کہوں کہ گوشہ اقبال مجید ''پر'' نکالنے کے بجائے اس کے ''اندر سے'' کیوں نہیں نکالتے۔ کیونکہ نرم گوشہ تو دل کے اندر ہوتا ہے اور اگر یہ کوئی باہر کی چیز ہے تو نکالنے کے بجائے اس کے اوپر ڈالنا چاہیے، جیسے روشنی ڈالی جاتی ہے یا کمبل وغیرہ ڈالا جاتا ہے۔ پھر وہی، اکلوتی چیز پھوٹنے کے ڈر سے خاموش رہا۔

حسن عابد کے اس جملے سے دوسری اہم اطلاع مجھے یہ ملی کہ اقبال مجید سے میری بہت دوستی ہے۔ میں ہمیشہ سے یہی سمجھتا آرہا کہ اقبال مجید کی مجھ سے دوستی ہے۔ میری کیا

فریقین کی پیدائش کے بغیر دوستی ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ہاں یہ ضروری نہیں ہے کہ پیدائش ایک ساتھ ہی ہوئی ہو۔ مختلف اوقات میں اور مختلف مقامات پر بھی ہوسکتی ہے۔ ایک ہی وقت میں اور ایک ہی جگہ پر تو پیدائش عام طور پر جڑواں بھائی بہنوں کی ہوتی ہے۔ اقبال مجید اور میری پیدائش مختلف اوقات میں اور مختلف مقامات پر ہونے کے باوجود مجھے اکثر یہ شبہ ہوتا رہا کہ اقبال مجید میرا کوئی جڑواں بھائی ہی ہے اور اگر اس کی آنکھیں بٹنوں کی طرح بہت چھوٹی نہ ہوتیں اور میں دماغی طور پر اتنا کمزور نہ ہوتا تو یہ شبہ کب کا یقین میں بدل چکا ہوتا، اور اس سلسلے میں وقت اور فاصلے کے معمولی فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس حقیقت کو آسانی سے نظر انداز کیا جاسکتا تھا کہ ہم دونوں کے والدین مختلف ہیں۔ میں ۵ رمئی ۱۹۳۵ کو امروہہ میں پیدا ہوا تھا۔ یہ بات تاریخ سے بھی ثابت ہے اور جغرافیہ سے بھی۔ مزید یہ کہ میں خود اس واقعہ کا چشم دید گواہ ہوں۔ اقبال مجید کے ایک خودنوشت سوانحی خاکے میں اس کی پیدائش جولائی ۱۹۳۴ میں بمقام مرادآباد درج ہے۔ اس بنیاد پر میری اور اقبال مجید کی پیدائش میں صرف نو مہینے اور تیس میل کا فرق ہے۔

دنیا کے کسی بھی قانون میں نہ صرف دوستی بلکہ عشق کے لیے بھی کم ازکم عمر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ میرے ایک چچا نے تو میری ایک ہونے والی چچی سے عشق اس وقت شروع کردیا تھا جب ان کی عمر آٹھ سال اور فریقۂ ثانی کی عمر ڈھائی ہفتے کی تھی۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ ان کے عشق کو کامیاب ہونے (سہرے کے پھول کھلنے) میں تقریباً پچیس سال لگے جس میں دس سال کا اذیت ناک وقفہ انھیں میری پہلی چچی کے ساتھ گزارنا پڑا، جن کے ساتھ میں دس منٹ بھی نہیں گزار پاتا تھا۔ کیونکہ ایک تو مجھے ان کی صورت سے بہت ڈر لگتا تھا، دوسرے امی جان جب بھی مجھے ان کی تحویل میں دے کر کہیں جاتیں تو وہ ٹھیک نو منٹ بعد یا تو میرے سوئی چبھو دیتی تھیں یا پھر اپنی صورت دکھا دیتی تھیں اور اس طرح سوئی چبھنے کی تکلیف کم ہوجاتی تھی۔ چچا نے خدا جانے کس طرح ان کو انتقال کرنے پر آمادہ کیا ہوگا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ میری اور اقبال مجید کی ملاقات میری پیدائش سے کم ازکم چودہ

شریف، خاندانی اور پڑھے لکھے شیعہ بزرگ حیدر مہدی صاحب سے عقد ثانی کرلیا تھا اور اپنی اکلوتی بیٹی نجمہ سمیت انھیں کے ساتھ رہتی تھیں۔ اقبال مجید کی دیکھ بھال حیدر مہدی صاحب بالکل اپنے بیٹے کی طرح کرتے تھے۔

عجیب زندگی تھی۔ ہم دونوں تقریباً پھکڑ تھے۔ مجھے گھر سے پانچ روپیہ جیب خرچ ملتا تھا جس میں ایک روپیہ بطور سالانہ ترقی اضافہ ہوتا تھا۔ مہنگائی الاؤنس غالباً اس لیے نہیں ملتا تھا کہ مہنگائی اس زمانے تک ایجاد نہیں ہوئی تھی، یا ہم جیسے غریبوں کی دسترس سے باہر تھی۔ کتابوں کاپیوں کے نام پر ملنے والی رقم سے ایک آدھ روپیہ بچ رہتا تھا۔ اقبال مجید کو گھر سے نکلتے وقت پھوپھی کی ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ کچھ نقدی بھی مل جاتی تھی۔ چنانچہ نوابوں کی طرح عیش کرتے تھے یعنی دن بھر میں تین چار بیڑیاں پی لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہفتے میں ایک آدھ بار چائے کی پیالی لے کر طشتری میں آدھی انڈیل لیتے اور پیالی دوسرے کی طرف بڑھا دیتے تھے۔ یوں ہم دونوں آپس میں دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے ''بیڑی شریک اور چائے شریک'' بھائی بھی بن گئے تھے۔ ہر چیز مل بانٹ کر کھانے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ (خدا کا شکر ہے کہ ان دنوں ہم میں سے کوئی ایک بھی بیوی والا نہیں تھا)۔ ہمیں تو اکیلے ڈانٹ کھاتے ہوئے دوسرے کی محرومی پر بڑا ترس آتا تھا اور دل کڑھتا تھا۔

میرے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ابا جان نے مجھے مضامین بدل کر کامرس میں داخلہ لینے پر اصرار کیا۔ دو سال میں اقبال مجید سے میری دوستی اس قدر پختہ ہوگئی تھی کہ میں اقبال مجید کے بغیر مضامین تو کیا کپڑے بدلنے کا بھی تصور نہیں کرسکتا تھا۔ ابا جان کے حکم پر میں نے بہت فیل مچایا اور اس بات پر اڑ گیا کہ میں اقبال مجید کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ ابا جان کے تو جیسے یہ سن کر آگ لگ گئی۔

''ہونہہ بڑا آیا اقبال مجید کا سگا۔'' انھوں نے ڈانٹ پلائی۔ ''قرآن مجید کا ساتھ چھوڑ دیا تو کچھ نہیں۔ اقبال مجید کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔'' اور ساتھ ہی انھوں نے میرے سر پر ایک زوردار دھپ جمائی۔ میرے لیے یہ پہلی دھپ تھی۔ ان کی اس بھاری دلیل میں

شخصیات سے ہوتی رہتی تھیں جن میں احتشام صاحب اور سرور صاحب کے علاوہ سجاد ظہیر صاحب اور ان کی بیگم رضیہ آپا، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن، رام لعل، عالیہ عسکری، باقر مہدی، قمر رئیس، قاضی عبدالستار، منظر سلیم، شہاب جعفری، مسیح الحسن رضوی، آغا سہیل، شارب ردولوی، رتن سنگھ، حسن عابد، عارف نقوی، احمد جمال پاشا، عابد سہیل، شارب لکھنوی، شور صہبائی، محسن زیدی، رضوان حسین، عثمان غنی، نجم الحسن، قیصر تمکین، شوکت عمر، احرار نقوی، شکیب رضوی، ذکی شیرازی وغیرہ شامل تھے۔ خاص خاص مواقع پر باہر سے علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، عصمت چغتائی، نیاز حیدر، حبیب تنویر، مظفر شاہجہان پوری وغیرہ بھی آجاتے تھے۔ ان نشستوں اور ان ملاقاتوں سے ہم لوگوں نے اتنا کچھ کمالیا تھا کہ اب عمر کے آخری حصے میں اس کے صرف ''سود'' اور اسلامی بنکاری کے مطابق منافع سے کام چلا رہے ہیں۔ اس فہرست میں یادداشت کمزور ہوجانے کی وجہ سے بہت سے نام شامل ہونے سے یقیناً رہ گئے ہوں گے۔ ایسے حضرات سے درخواست ہے کہ وہ خود اپنے نام کا اضافہ کرلیں۔ (بشرطیکہ وہ ابھی تک بقید حیات ہوں)۔

۱۹۵۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو اقبال مجید اور میں مختلف فیکلٹیوں میں تھے۔ میری زندگی میں عجیب سا تضاد پیدا ہوتا جارہا تھا۔ نصاب میں مضامین تو کامرس اور اس سے متعلق تھے مگر حلقۂ احباب میں زیادہ تعداد ادب کے طالب علموں کی تھی اور غیر از نصاب سرگرمیاں بھی اسی شعبے سے متعلق تھیں جس کی وجہ سے ذہنی رجحان ادب کی طرح ہوگیا تھا۔ چنانچہ اپنے خالی پیریڈ کے علاوہ بھی اقبال مجید، حسن عابد اور احمد جمال پاشا وغیرہ کے ساتھ اردو کی کلاس میں اور بطور خاص احتشام حسین صاحب کے لیکچروں میں زیادہ شرکت کرتا تھا۔ احتشام صاحب کے لیکچروں اور ان کی خصوصی شفقت نے میرے ذہن اور شعور پر جیسے صیقل کا کام کیا۔ فارغ اوقات یعنی اپنی کامرس کی کلاسوں اور ''گجنگ'' سے وقت نکال کر اقبال مجید کے ساتھ امیر الدولہ پبلک لائبریری میں جا کر بیٹھ جایا کرتا تھا اور وہاں سے کتابیں گھر پر لاکر چوری چھپے پڑھتا تھا۔ اس کا نتیجہ حسب توقع نکلا۔ بقول

پریم کمار بزاز، نسیم کنجاہی اوران کی بیٹی کنول کنجاہی کے علاوہ کئی دوسرے اردو، ہندی اور پنجابی زبان کے ادیب وشاعر حضرات بھی شرکت کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک نشست میں اقبال مجید نے بڑے خوب صورت ترنم میں اپنی ایک غزل سنائی تھی جس کا ایک شعر تھوڑے ہی عرصے بعد ہم سب دوستوں کی زندگی پر لفظ بہ لفظ صادق آ گیا تھا:

یوں اجڑی احباب کی محفل
کس سے پوچھیں کون کہاں ہے

مضمون کے آغاز میں میں نے حسن عابد کے ساتھ اپنی دوستی کا تذکرہ کیا ہے جس کی ابتدا ناپسندیدگی سے ہوئی تھی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ میں شروع شروع میں پانی اور چائے کے علاوہ ہر مشروب بالخصوص کافی کو حرام اور شراب کی قسم کی کوئی چیز سمجھتا تھا۔ اقبال مجید کے ساتھ کافی ہاؤس اکثر جانا تھا۔ وہاں کے مستقل گاہکوں سداسرن مصرا اور بھیلا کے علاوہ اکثر مجاز صاحب، باقر مہدی، حسن شہیر، منظر سلیم اور ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ بھی بیٹھے ہوئے ملتے تھے۔ میں بھی گھنٹوں ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھا رہتا تھا مگر کافی جیسی ''حرام شے'' کو منہ نہیں لگاتا تھا۔ بہت دنوں کے بعد ان دوستوں کے اصرار پر اسے چکھا ضرور مگر عرصہ تک ایک گناہ کا احساس رہا۔ حسن عابد یونیورسٹی میں اقبال مجید کے ساتھ ہوتے تھے۔ میری ان سے صرف دعا سلام کی حد تک ملاقات تھی۔ ایک روز شام کو میں اپنے معمول کے مطابق اقبال مجید کے گھر گیا تو انھوں نے آنکھوں میں مستی کی کیفیت کے ساتھ تھوڑی بہت ایکٹنگ شامل کر کے ایک واقعہ کی تفصیل بیان کی جس کے مطابق بھیگے ہوئے موسم کی قیامت خیزی اور حسن عابد کی شہ پر اس روز دوپہر کو ان لوگوں نے اقبال کا یہ مصرع پڑھتے ہوئے کہ ''علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی'' ایک محفل سجائی تھی۔ اقبال مجید کے بیان کو میں نے محض مذاق سمجھا لیکن اس واقعہ کی تصدیق کرانے کے لیے وہ مجھے قمر رئیس کے پاس لے گئے جہاں یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی۔ مجھے اقبال مجید اور قمر رئیس پر تو غصہ آیا ہی، مگر حسن عابد سے مجھے ایک طرح کی نفرت ہوگئی اور میں نے اس کے لیے اپنے دل میں پیدا ہونے والے دوستی کے جذبات کو وہیں کچل

تک پورا کرتا تھا، انتہائی کفایت کے ساتھ خرچ کر کے۔ اگر مہینے کے شروع ہی میں کسی وجہ سے جیب خالی ہو جاتی تو اسے بھی آخیر مہینے تک پورا کرتا تھا بالکل نہ خرچ کر کے۔ اس طرح مہینے کے سب دن ایک سے رہتے تھے۔ نہ ساون سوکھا اور نہ بھادوں ہرا۔ بس یہ ایک عادت سے بن گئی تھی۔ ایک عادت اقبال مجید کی بھی تھی جو اس کے بالکل برعکس تھی۔ اس کے پاس جب بھی پیسے آتے تھے، اس کے ہاتھ میں جیسے کھجلی سی ہونے لگتی تھی اور وہ کوشش کرتا تھا کہ جلد از جلد سارے پیسے خرچ ہو جائیں۔ پیسے سب ختم ہو جاتے تھے مگر اس کی خرچ کرنے کی کوشش جاری رہتی تھی اور اکثر کامیاب رہتی تھی، دوسرے کے پیسے خرچ کر کے۔ یہ اس کی اپنی عادت تھی جو اس نے بڑی محنت کر کے اپنائی تھی۔ دراصل ہماری دوستی پختہ ہونے کی اصل وجہ بھی یہی تھی کہ ہم نے ہمیشہ نہ صرف ایک دوسرے کو اپنا سمجھا بلکہ ایک دوسرے کی جیب کو بھی اپنی ہی جیب کی طرح برتا۔ اپنی جیب کے معاملے میں کبھی بخل سے کام لیا ہو تو لیا ہو، دوسرے کی جیب کے معاملے میں ہمیشہ فراخ دل رہے۔ بلکہ ہم دونوں کا ہاتھ ہوتا ہی ایک دوسرے کی جیب میں تھا۔ اس طرح ہم لوگوں کی جیبوں کی مستقل حفاظت بھی ہوتی رہتی تھی خواہ پھٹی ہوئی ہی کیوں نہ ہوں۔ دوسرے الفاظ میں ہماری جیبیں اگر ''دست'' سے نہیں تو ''برد'' سے تو بہر حال محفوظ رہتی تھیں۔

جب کہیں سے پیسے آتے تھے تو ہم لوگ خرچ کا آغاز امین آباد میں کچہری روڈ پر واقع نوری ہوٹل سے کرتے تھے۔ اقبال مجید اکڑ کر، آواز میں رعب پیدا کر کے، اسپیشل چائے کے ساتھ سلائس اور ایک ایک ہاف فرائی انڈے کا آرڈر دیتا تھا۔ جب آرڈر آجاتا تو ہماری آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آجاتی۔ خوب اچھی طرح نمک اور سیاہ مرچ کا چھڑکاؤ کرتے اور چھری کانٹے کی مدد سے بڑی احتیاط سے انڈے کو چاروں طرف سے تھوڑا تھوڑا کاٹ کر کھاتے اور جب بالکل درمیان میں صرف زردی رہ جاتی تو بڑی نزاکت اور آہستگی کے ساتھ کانٹا انڈے کے نیچے سرکاتے جاتے اور دل کی دھڑکنوں کو قابو میں کرتے جاتے۔ پھر بالکل سانس روک کر کانٹے پر رکھے ہوئے انڈے کو آہستہ آہستہ

زائد بہنوں کا بھائی ہوتے ہوئے انھیں بہن بنانا پڑا۔ وہ تو خود کمال ہوشیاری سے ''بھیا'' کہہ کر چھوٹ گئیں مگر میرے لیے ان کے اصل نام عصمت آرا سے زیادہ ان کی عرفیت ''چھوٹی بیگم'' ایک عرصے تک بے حد ذہنی خلجان کا باعث بنی رہی۔ مگر میں بھی بڑا ہوشیار نکلا اور ایک ''شارٹ کٹ'' نکال کر انھیں 'بھنو' کہنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی اقبال مجید پر بھی دباؤ ڈالا کہ تم بھی آئندہ سے چھوٹی بیگم نہیں کہو گے کیونکہ اس سلسلے میں مجھے غصہ اس وقت آتا تھا جب اکثر لوگ میری موجودگی میں اقبال مجید سے اس کی ''بڑی'' اور ''منجھلی'' بیگموں کی خیریت معلوم کرتے تھے اور وہ انتہائی بے حیائی سے میری توجہ دوسری طرف لگا کر ان کی خیریت بتا بھی دیتا تھا۔ مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں اقبال مجید اس پیچیدہ صورت حال سے نپٹنے کے لیے واقعی لشتم پشتم دو اور شادیاں نہ کر ڈالے۔ میں نے اس پر واضح کر دیا کہ میں اس کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا اور محض اتنی معمولی سی وجہ سے خود اسلام بھی اجازت نہیں دیتا۔

۱۹۵۳ اور ۱۹۵۶ کے درمیان اقبال مجید نے اپنی (اس وقت تک کی) زندگی کے بہترین افسانے لکھے جن میں سے چند تو اسی زمانے میں مختلف ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے۔ کئی ایک افسانے ہندوستان اور پاکستان سے نکلنے والے مختلف رسالوں کے ''سال کے بہترین افسانے'' یا ''سال کا منتخب ادب'' کے ناموں سے انتخاب میں بھی شامل ہوئے۔

اسی کی دیکھا دیکھی میں نے بھی افسانے لکھنے شروع کیے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اقبال مجید نے افسانہ نگاری مجھے بالکل اسی طرح سکھائی جس طرح بچے کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا جاتا ہے تو یہ کچھ غلط نہ ہوگا۔ میری بے اعتباری تھی کہ میں اس ڈر سے انگلی چھڑا لیا کرتا تھا کہ کہیں وہ انگلی پکڑتے پکڑتے پہنچا نہ پکڑ لے۔ یہ بات مجھے اسی نے بتائی بلکہ بہت سی مثالیں دے کر سمجھائی کہ افسانہ لکھنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز قلم اور کاغذ ہے۔ ہاں اچھا افسانہ لکھنے کے لیے تھوڑا سا دماغ بھی ہونا ضروری ہے جو مطالعہ وغیرہ میں کام آتا ہے۔ مجھے پہلے ہی سے بہت دماغ تھا جو میں کبھی کبھار کام میں لاتا تھا۔ اس کے علاوہ افسانہ سننے،

لوگ'' کب کے سوکھ سوکھ کے بالکل کھڑنک ہوکر میرے کسی کام کے نہیں رہے ہوں گے اور خدا جانے دو سے بڑھ کر ان کی تعداد کتنی ہو چکی ہوگی۔

اقبال مجید سے جو ''چھوت'' کی بیماریاں مجھے لگی تھیں ان میں پاکستان کی ''روح پرور'' اور ''ایمان افروز'' فضا میں داخل ہوتے ہی افاقہ ہونا شروع ہو گیا تھا، خصوصاً افسانہ نگاری کا ''معیادی بخار'' تو ابتدائی چار پانچ سالوں میں ہی اتر گیا تھا۔ دوسری بیماریاں جو ذرا زیادہ پیچیدہ تھی ان کو فائدہ اس مسلسل علاج سے ہونا شروع ہو گیا جو میں نے بعد میں غیر ادبی اور نیم سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے کر شروع کر دیا تھا۔ یہ علاج اس قدر موثر اور کارگر ثابت ہوا کہ میں دس بارہ سال میں کلی صحت یاب ہو کر بالکل چاق و چوبند ہو گیا۔ مگر فائدہ پھر بھی جاری رہا۔ حد یہ ہے کہ علاج چھوڑنے کے بعد تو ہونے والے فائدے میں مزید تیزی آتی گئی اور میں اگلے بیس پچیس سال میں جہالت، بے علمی، کم فہمی کے میدان میں ترقی کرتے کرتے کہاں کا کہاں پہنچ گیا۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ میرے پڑھنے کی بری عادت چھوٹ گئی اور جاہلانہ سرگرمیوں میں خوب دل لگنے لگا۔

غالباً ۱۹۸۷ میں ایک دن امریکہ میں قیام کے دوران ایک افسانوی مجموعہ ''ایک حلفیہ بیان'' ملا جس کے سرورق پر اقبال مجید کا نام لکھا تھا۔ میری تو خوشی کے مارے بری حالت ہوگئی۔ میں نے برسوں کے بعد اقبال مجید کا نام چھپا ہوا دیکھا تھا، وہ بھی ایک کتاب پر۔ میں نے کتاب کو بار بار چوما اور جوش محبت کے مارے اقبال مجید کے دھوکے میں اپنی بیوی کو چوم بیٹھا۔ اشتیاق اور بے چینی میں ادھر ادھر سے چند صفحات پلٹے تو مجھے اندازا ہوا کہ کہیں کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ ہو نہ ہو یہ پریس والوں کی کارستانی ہے اور کسی اور کی کتاب پر اقبال مجید کا نام چھاپ دیا ہے۔ اتنی مدت گزر چکی ہے دنیا کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے مگر برصغیر کے چھاپہ خانے وہی منشی نول کشور کے فقیر بنے ہوئے ہیں اور بیچارے منشی جی مرحوم کو پیٹے جا رہے ہیں۔ ذرا جو اپنے طریقہ کار بلکہ طریقہ بے کاری میں تبدیلی لائے ہوں۔ پھر اچانک ہی جانی پہچانی، خوب صورت تحریر دکھائی دی جو اقبال مجید نے بڑے خلوص، محبت اور میرے لیے انتہائی پیار